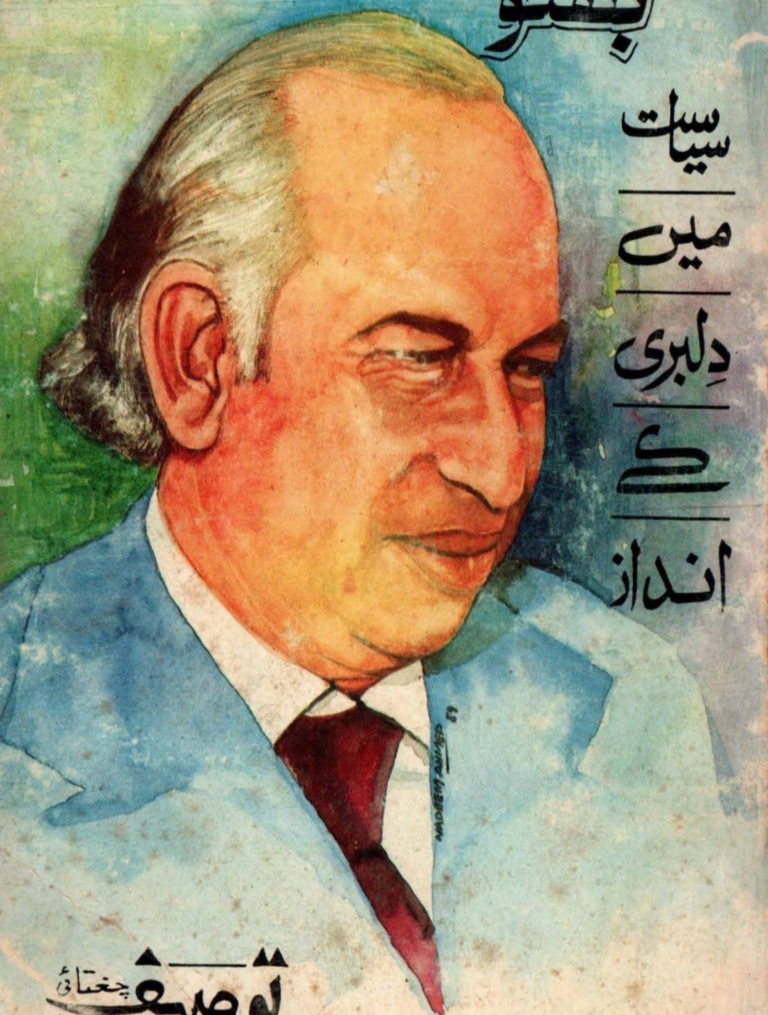
ذوالفقار علی بھٹو



سیاست میں دلبری کے انداز

توصیف چغتائی

توصیف چغتائی

ذوالفقار علی بھٹو

سیاست
میں
دلبری
کے
انداز



کبھی تو سوچنا یہ تم نے کیا کیا لوگو
یہ کس کو تم نے سرِ دار کھو دیا لوگو

فیضؔ

ذوالفقار علی بھٹو

سیاست میں دلبری کے انداز

توصیف چغتائی



NATASHA COMMUNICATION
Publication Division

H-3/M.Y. SQUARE, Block G,
North Nazimabad,
Karachi.



PRIME MINISTER'S SECRETARIAT (PUBLIC)
PRIME MINISTER'S HOUSE.
RAWALPINDI
March 27 1974

Dear Mr. Tosif Chughtai,

Your letter addressed to Miss Benazir Bhutto has been received in Begum Nusrat Bhutto's office. You have requested Miss Benazir Bhutto to preside over the launching ceremony of your book " Bhutto Hukoomat Main Dil Baree Ka Andaz in the month of May, and further to send a message for the Souvenir to be published on this occasion.

I am writing to thank you on behalf of Miss Benazir Bhutto for the invitation but regret that Miss Bhutto will not be able to attend as she is studying abroad, and might not be in Pakistan during the month of May.

However we extend our good wishes to you and hope that your book is a great success.

Yours sincerely,

(Miss Iffat Halim)
Secretary to Begum Nusrat Bhutto.

Mr. Tosif Chughtai,
Monthly "Hamdard-I-Sechat"
Almajeed, Nazimabad,
Karachi-18.

From: Mazhar S. Kazi, LL.B (Hons) (London), Bar-at-Law,
Press Secretary to the Prime Minister,



PRIME MINISTER'S HOUSE,
RAWALPINDI.

No.F.6-1/75-Press.   30th July, 1975.

Dear Mr. Chughtai,

I am desired by the Prime Minister to thank for a copy of your Book "ذوالفقار علی بھٹو حکومت میں دلیرانہ انداز".

which you so very kindly presented to the Prime Minister.

With best wishes,

Yours sincerely,

Mr. Tosif Chughtai,
122/M/2, PECHS,
Karachi-29.

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: توصیف چغتائی

کتابت: انوار ہاشمی، سید اعجاز علی

مطبوعہ: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی

سرورق: ندیم احمد - ٹرانسپیرنسی ▪ الیاس احمد خان

تقسیم کار:

ویلکم بک پورٹ

شاہراہ قائدین کراسنگ طارق روڈ کراچی

فون: ۴۴۰۸۰۸

برانچ مین اردو بازار کراچی

فون: ۲۱۸۰۸۹ - ۲۱۸۰۱۶

پہلا ایڈیشن، مارچ ۱۹۷۴ء دوسرا ایڈیشن، ترمیم و اضافہ کے ساتھ

قیمت: ۳۵ روپے فروری ۱۹۸۹ء

انتساب

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن محترمہ

بیگم نصرت بھٹو

کے نام احترام و عقیدت کے ساتھ

توصیف چغتائی

فہرس

”فرعون زمین پر بڑا بن بیٹھا
اس نے اہلِ زمین کو طبقات میں بانٹ دیا اور
ایک طبقے کو کمزور کر دیا،
پھر ہم نے ارادہ کیا کہ جنھیں زمین پر کمزور کر دیا گیا ہے
ان پر نظرِ کرم کریں،
انھیں امامت بخشیں،
وارث بنائیں اور زمین پر حکمرانی دیں“

(القصص ۶/۴)

گفتگو بجائے پیش لفظ

انیس تفضل

توصیف چغتائی نئی نسل کے ایک ذہین ڈرامہ نویس ہیں۔ ریڈیو، اسٹیج اور ٹی وی کے لیے ان کا نام نیا نہیں۔ انھیں اپنے کئی ڈراموں پر انعامات مل چکے ہیں جن میں "ج اکبر" اور "ہمسفر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی تین کتابیں ہندوستان میں شائع ہو چکی ہیں۔

توصیف نہ صرف ڈرامے لکھتے ہیں بلکہ ایک اچھے ہدایت کار بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈرامہ نویس جو کچھ لکھتا ہے وہ اس کے اپنے جذبات ہوتے ہیں جنکی عکاسی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ موثر انداز میں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ "لڑکا ایک دیوانہ سا" "ہم تن کے اجلے لوگ" "آخر شب کا ہمسفر" "سویرا کب ہوگا؟" ان کے مقبول ڈرامے ہیں۔

فنکار کی دنیا میں جذبات کا کتنا گہرا دخل ہوتا ہے اس کا اندازہ ہمیں توصیف چغتائی سے نئی نسل کے مسائل پر گفتگو کے دوران میں ہوا۔ توصیف عام نوجوانوں سے

ڈسے مختلف انداز میں بات کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پہ کرب کے آثار نمایاں تھے لہٰذا وہ بڑی تلخی سے کہہ رہے تھے،

"نوجوانوں کا کیا قصور ہے۔ ہمیں تو جو سوچ ملی ہے وہ بڑی غلط ہے۔ لوگ نوجوانوں کے مسائل کو مختلف رنگ دیتے ہیں۔ کوئی انہیں بے راہ روی کا الزام دیتا ہے تو کسی کے نزدیک ان کا ہر عمل حقیقت سے فرار اور مغربی تہذیب کی نقالی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ سارا کھیل "بڑے آدمی" کے اس تصور کا ہے جو ہمیں اپنے بزرگوں نے دیا ہے۔

اپنے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے چغتائی صاحب نے کہا، "ایک زمانہ وہ تھا جب بچوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ "بڑا آدمی وہ ہے جو اپنے ملک کے لیے کوئی عظیم خدمت انجام دے۔ جس کے کردار میں راست گوئی، سادگی، دیانت اور انسانی رشتوں کا احترام ہو۔ اسی سوچ کے ساتھ وہ عمر کی منزلیں طے کرتا اور اس کی زندگی ایسے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے، لیکن؟" چغتائی صاحب نے سوال کیا، "ہمیں کیا بتایا گیا؟ یہی نا کہ بڑا آدمی وہ ہے جس کے تصرف میں زندگی کی ساری آسائشیں موجود ہوں، جو کار، بنگلہ اور بینک بیلنس رکھتا ہو۔ جو شخص جتنے زور سے سکوں کو کھنکا سکتا ہے وہ اتنی ہی بڑی حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔

نئی نسل دولت کے رشتوں کے درمیان پل کر جوان ہوئی ہے۔ توصیف چغتائی کہہ رہے تھے "ہمارے بزرگوں نے اس سوچ کو جلا بخشی اور اسے اپنے عمل کے ذریعے پروان بھی چڑھایا۔ معاشرے کی یہ ساری افراتفری اسی اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ جس معاشرے میں انسان کے بجائے دولت کو بنیادی حیثیت دی جائے گی وہاں جھوٹ، تصنع، ظاہری شان و شوکت، لوٹ کھسوٹ، رشوت، سفارش اور دیگر سماجی ناانصافیاں ضرور جنم لیں گی"

• بڑا آدمی بننے کی ایک دوڑ ہے جس میں معاشرے کا ہر فرد شامل ہونا چاہتا ہے۔ ایسے میں محض نوجوانوں سے یہ کیوں توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دوڑ سے الگ رہیں" یہ توصیف بڑے دکھ سے سوال کر رہے تھے۔

توصیف چغتائی نے کہا، "ہماری نسل کا المیہ یہ ہے کہ خلوص، محبت، جو اس کا حق تھا وہ بھی اس کو نہ مل سکا۔ نیا ملک بنا تو پرانی روایتیں ٹوٹنے پھوٹنے لگیں۔ بزرگ بھی اپنی روایتوں پر قایم نہ رہ سکے۔ وہ معیار زندگی بہتر بنانے کی کوشش میں اتنا الجھے کہ اپنے بچوں پر توجہ نہ دے سکے۔ ہماری خاندانی زندگی کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ بچوں سے محبت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ جوں جوں بچہ بڑا ہونے لگتا ہے والدین سے اس کا تعلق جیسے کم ہوتا جاتا ہے۔ والدین اور بچے کے درمیان ادب اور حجاب کے پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ بڑوں کا احترام اپنی جگہ، لیکن بچے کی شخصیت کی تعمیر میں محبت اور اپنایت کا اظہار بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معاشرے کو مستحکم بنانے کے لیے بھی محبت کی ضرورت ہے جس سے نوجوان محروم رہے اور ہر ایک محرومی کئی محرومیوں کو جنم دیتی ہے۔ پھر دونوں طرف تلخیاں اور شکایتیں پیدا ہوتی ہیں اور یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ نئی نسل اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور والدین انھیں مورد الزام ٹھہراتے رہے ہیں۔"

ان الزامات کی فہرست طویل ہے۔ توصیف چغتائی نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا، "ایک تو یہ کہا جاتا ہے کہ نئی نسل زیادہ آزادی مانگتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کا یہ تصور ہمارے پاس کہاں سے آیا؟ ہمارے بزرگوں نے اپنی نئی نسل کے لیے کوئی راہیں متعین نہیں کیں۔ پھر یقیناً ہم رہنمائی کے لیے دوسروں کی طرف دیکھیں گے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا اثر قبول کریں گے۔ پھر جب ہم دیکھتے ہیں

کہ وہ جنھوں نے اس معاشرے میں مذہب کے نام پر منافقت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اپنے قول و فعل میں زمین آسمان کا تضاد رکھتے ہیں تو پھر خیال آتا ہے کہاں سے تو ہم ہی اچھے ہیں۔ یہاں سے بغاوت کی لہر اٹھتی ہے۔ اپنے معاشرے کے خلاف، پرانی روایات کے خلاف اور ان کے خلاف جو بظاہر "بہت بڑے ہیں"۔

توصیف چغتائی صاحب کے خیال میں نئی اور پرانی نسل کے درمیان ذہنی فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ انھیں جنریشن گیپ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ہم نے نوروایت کا بڑا بوجھ برداشت کیا ہے۔ حالات کی چکی میں پستے رہے ہیں اور بڑی حد تک ہم نے اپنے بزرگوں کی روایت سے سمجھوتہ کیا ہے لیکن اب جو نسل پروان چڑھ رہی ہے وہ ہماری طرح پرانی قدروں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گی۔ آئندہ نسل کے نوجوانوں کی اگر صحیح رہنمائی نہیں کی گئی۔ اگر ان کے لئے سازگار ماحول پیدا نہیں کیا گیا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کے مواقع نہیں دیے گئے تو وہ ایک دھماکہ ثابت ہو گی پھر اس سیل رواں کو روکنا مشکل ہو جائے گا اسلیے بہتر ہے کہ ہم اپنے لیے معاشرتی اقدار کا تعین کر لیں تاکہ ہمارا معاشرہ مزید افراتفری سے بچ جائے۔

توصیف چغتائی ایک ایسے معاشرے کے حامی ہیں جس میں طبقاتی مقابلے کی دوڑ نہ ہو۔ انسان کی صلاحیتوں کی۔ اس کے علم و فن کی اور محنت کی عزت ہو۔ ایک صاف ستھرا ماحول ہو جہاں سب مل جل کر ایک اجتماعی احساس کے ساتھ کام کریں۔

توصیف چغتائی کے خیال میں معاشرے کی از سر نو تعمیر میں انفرادی کوششیں بھی بڑی حد تک معاون ثابت ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن کے ہاتھ میں قلم ہے وہ اپنی تحریروں سے اس غلط سوچ کو بدلنے کی کوشش کر سکتے ہیں جو معاشرے کی افراتفری کا باعث ہے۔ اچھائی کا سفر ایک فرد سے شروع ہوتا ہے جو جاری ہے۔ رفتہ رفتہ ہم سب میں یہ شعور بیدار ہو جائے گا کہ انسان کا مرتبہ مادی چیزوں سے کہیں

اعلیٰ ہے اور محنت میں عظمت ہے۔ تب ہم اپنا ماحول خود ہی بدل لیں گے۔

توصیف چغتائی نے کہا "میں بھی انفرادی کوشش کرتا ہوں۔ میں جو ڈرامے لکھتا ہوں اس میں انسان کی عظمت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور موجود ہوتا ہے۔ میں حالات سے دل برداشتہ ضرور ہوں لیکن مایوس نہیں۔ سوچتا ہوں کہ جو کچھ ہمارے حصے میں نہ آسکا۔ اگر وہ صاف ستھرا ماحول ہماری کوششوں سے آنے والی نسل کو میسر آجائے تو یہ ہمارا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ ہمارے بزرگ اگر ہم پہ بے جا تنقید کرنے کے بجائے اس راستے کی طرف بڑھنے میں ہماری مدد کریں تو یہ ان کا ہم پر احسان ہوگا۔

ہمیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ سوچی منہ عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی قوم میں تعمیری سوچ پیدا کی اور اس کے لیے انھوں نے بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں۔ ویت نام کا ہر انسان عظیم ہے، اسلیئے ہمیں بھی اپنی ذاتی محرومیوں کو بھلا کر ہر لمحہ تعمیری کام انجام دینے چاہیں" توصیف چغتائی نے کہا "ہم نوجوان بڑے دکھی ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد اپنی جد وجہد میں تنہا مصروف ہے۔ جو کچھ سوچ سکتا ہے وہ مایوسی اور ذہنی کرب کا شکار ہے۔ مجھے دیکھیئے میں بہت بڑا فنکار نہ سہی لیکن فن کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کیا ہے اور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اپنے گھر والوں کے لیے اور معاشرے کے لیے اب تک بڑا آدمی نہ بن سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی بڑے آدمی کے نام سے پہچانا جاؤں مگر راستے میں اونچی اونچی دیواریں حائل ہیں۔ کس کس دیوار کو ڈھایا جائے۔ اس معاشرے میں تو علم و فن کو ناپنے کا پیمانہ بھی دولت ہے۔ یہاں تو ماحول اتنا پراگندہ ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کا بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ہر جگہ کچھ لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ دوستیوں کے سلسلے دراز ہیں۔ جو آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کے لیے سفارش یا رشوت کا سہارا ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو

مایوسی اور ناکامی اس نوجوان کا مقدر بن جاتی ہے۔ وہ معاشرے کے تضادات کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب ایک بہتر مستقبل کی راہ میں ناقابل تسخیر دیواریں حائل ہوں تو پھر وہ فرار کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جو حالات سے لڑ نہیں سکتے وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ انہیں مجبوراً ان راہوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے جن پر وہ جانا نہیں چاہتے۔ آپ چاہیں تو اسے فرار کہہ لیں، بے راہروی سے تعبیر کریں یا اخلاقی دیوالیہ پن کا نام دیں مگر یہ بتائیے ان نوجوانوں کا کیا قصور ہے جنھیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے مواقع نہیں ملتے، جن کی ذہنی تربیت خام ہے اور جن کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی میں تلخیاں ہی تلخیاں ہیں۔"

"آپ کو اپنے بزرگوں سے بڑی شکایتیں ہیں؟" میں نے توصیف کے لہجے کی گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں کیوں نہ ہوں، بزرگوں سے شکایتیں ہیں، یا یوں کہہ لیں کہ اس ماحول سے شکایتیں ہیں جس میں ہم پروان چڑھے ہیں۔ میں نے بڑی عملی زندگی گزاری ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے نکل کر بڑی ٹھوکریں کھائیں۔ میں تو ایک فنکار کا احساس دل رکھتا ہوں ایسے ماحول سے کم از کم میں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ جہاں قدم قدم پر انسان کی بے مائیگی اور دولت کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ جہاں ہر شے پر سماجی حیثیت اور طبقات کی چھاپ ملتی ہے۔ جب تک اس سوچ میں بنیادی تبدیلیاں نہیں آئیں گی تب تک معاشرے میں یہ افراتفری جاری رہے گی۔"

اخبار خواتین

۱۹ر جنوری ۱۹۷۴ء

اندھیرے کا سفر

ماضی اپنی تمام تر تلخیوں کے باوجود حسین ہوتا ہے، مگر ہمارے اپنے ملک کا ماضی کتنا تلخ اور کتنا کسیلا ہے جسمیں نہ تلخیوں کا نشہ ہے نہ یادوں کے کانٹوں کی دلربا چبھن ——

آج دسمبر ۱۹۷۱ء کی ۴ تاریخ ہے۔ آج کی صبح بڑی ویران تھی۔ دم گھٹتا جا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ میرے اپنے داخلی اور خارجی احساسات ہوں۔

رات دو بجے تک میں پڑھتا رہا۔ دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔ یوں جان پڑتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ بھارت نے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی نئے محاذ کھول دیئے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں خون بہہ رہا ہے۔ اپنا، ہمارا اپنا خون۔ یہ دن رات کتنے خوں رنگ ہیں۔ خون ہی انسانی رشتوں کو استوار کرتا ہے اور اب یہی خون بہہ رہا ہے۔ رشتے کچے دھاگوں کی مانند ٹوٹ رہے ہیں، انسانیت بکھر رہی ہے۔

کل رات کا آخری پہر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ بلیک آؤٹ کی پہلی رات تھی۔ ذہن پر اس کا تاثر لے کر سویا، رات میں جانے کیا ہو؟

گھن گرج سے آنکھ کھل گئی۔ سمجھا بادل گرج رہے ہیں، ابر باراں برسنے والا ہے۔ شاید بارش ہو جس سے ہماری اپنی تمام نفرتیں، کینگیاں اور انسانیت کے آنچل کے کالے داغ دھل جائیں، مگر آسمان صاف تھا اور رات کے پچھلے پہر کا چاند اداس

اداس سا آسمان پڑیکا ہوا تھا۔ گھن گرج بڑھتی ہی گئی۔ باہر نکل کر دیکھا۔ سامنے جنگی پھلجھڑیاں ایستادہ تھیں۔ انسانُ انسان کے زخم لگانے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔ یہ بھارت کا پہلا ہوائی حملہ تھا۔

آج جنگ کا ساتواں دن ہے۔ یہ دو راتیں بڑی سخت تھیں۔ ہندوستان نے دل کھول کر بم گرائے۔ مکان ہی کیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کائنات کی تمام چیزیں درہم برہم ہو رہی ہیں۔ بھاری بمباری نے کراچی کی بندرگاہ پر تین تجارتی جہازوں کو آگ لگادی۔ ایک تیل کی ٹنکی برباد ہوگئی۔ آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا ہے۔ دو بموں نے کراچی کی ایک بستی سلطان آباد کے قریب کے مکانوں کو مسمار کر دیا ہے۔ لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا ہے۔ لوگ ادھر سے ادھر منتقل ہو رہے ہیں۔ صبح کے اخبارات میں مسمار گھروں اور غریب عوام کی نعشوں کی بے انتہا تصویریں ہیں۔ یوں جان پڑتا ہے کہ میں ویٹ نام کے کسی قصبے کی تصویریں دیکھ رہا ہوں۔ یہ شہر کراچی ہے، پاکستان کا دل، پاکستان کا سب سے خوبصورت شہر۔ آج یہ شہر کیوں جل رہا ہے؟ لوگوں کے چہرے اداس اداس کیوں ہیں؟

نگاہیں جیسے کسی محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کو تلاش کر رہی ہیں۔ کیا اتنے بڑے ملک میں محمد بن قاسم کا کوئی جانشین نہیں ـــ یہ کیسا سناٹا ہے؟ آمریت کے کالے ناگ خاموشی سے اپنے بلوں میں سر نہوڑائے بیٹھے ہیں، یہ کیسی خاموشی ہے؟

آج سولہ دسمبر ۱۹۷۱ء کا منحوس دن ہے۔ ڈھاکے میں بھارتی فوجیں اندر تک داخل ہوگئی ہیں۔ ہمارا ریڈیو قومی ترانے خالص فلمی نغموں کے انداز میں الاپ رہا ہے۔ ملکۂ ترنم فوجیوں سے خطاب کر رہی ہیں۔ شرم شرم، شرم!

اس ملک میں آوازوں کا قحط ہے، کوئی آواز نہیں، کوئی راہ نہیں، کوئی

بھی تو نہیں جو اپنے جوانوں سے خطاب کر سکے انہیں جوش اور نئے ولولوں سے آشنا کر سکے۔

۵ بجے کے نیوز بلیٹن میں یہ خبر سن کر دل بیٹھ گیا کہ مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو گیا اور ایریا کمانڈروں میں سمجھوتے کے بعد جنگ بند ہو گئی۔ لوگ خبر سنتے ہی رو دیئے ہیں اور اپنے ٹوٹے دلوں کو تھامے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ لوگ رو رہے ہیں۔ کائنات رو رہی ہے۔ یہ کیسا غم ہے۔ کیا تاریخ میں کوئی ایسی مثال، کوئی ایسا لمحہ موجود ہو، جب انسانوں نے اپنے آپ سے اتنی بڑی سفاکی برتی ہو؟ اگر مورخ تاریخ لکھ رہا



جناب بھٹو، یحییٰ خاں ایک یادگار تصویر

ہے تو یہ لکھتے وقت اس کے ہاتھوں میں لرزش ضرور آئی ہو گی۔ خداوندا یہ زخم کتنا گہرا ہے۔ اب کیا ہو گا؟ ہر چہرہ ایک سوال ہے۔

پیارے قارئین! یہ میری ڈائری کے چند سیاہ ورق تھے، یہ پاکستان کی تاریخ کے سیاہ دن تھے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے سیاہ موڑ تھا جب ہم ایک عظیم

المیہ سے دوچار ہوئے۔ ایک ایسا المیہ جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا۔ اس المیے نے ملک کے بچے بچے کو بکھیر کر رکھ دیا، ہر فرد زخم زخم تھا، دل شکستہ تھے۔

ہمیں جس عظیم شکست سے دوچار ہونا پڑا اس کی وجہ اپنوں کی غداریاں اور غلط پالیسیاں تھیں۔ آمریت کے کالے ناگوں کے زہر اور غلط پالیسیوں نے قوم کو مایوسی اور قنوطیت کے حصار میں جکڑ لیا تھا۔

میں یادوں کی دہلیز سے آج بھی ماضی کو دیکھ رہا ہوں جہاں اقتدار اور بربریت کی آگ نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک الاؤ دہکا رکھا تھا۔ عوام، غریب عوام جذباتی ہو کر سیاسی مداریوں کی ڈگڈگی پہ ناچ رہے تھے، جہاں پاکستان کے بہت سے مسائل برسوں سے حل طلب تھے۔ یہ مسائل نظریاتی، سیاسی، معاشی اور



جناب بھٹو، ایوب خاں اور ہندوستان کے وزیر اعظم شاستری

معاشرتی نوعیت کے تھے اور ان مسائل نے ساری قوم کو قومی اور ملی زندگی میں اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ ان مسائل کے صحیح اور پائیدار حل پر پاکستان کی بقا، استحکام اور پاکستانی عوام کی خوش حالی کا دارومدار تھا، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ قوم کو یکجہتی اور سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کرنے اور ان کے مناسب حل تلاش کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیے جا سکے جس کی وجہ سے ملک میں سیاسی انتشار، جمہوریت کا عدم استحکام، جمہوریت کش رجحانات اور آئینی بحران دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

دراصل اس کی تمام تر ذمہ داری ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے مگر افسوس کا مقام تھا کہ وہ ماضی کے سبق کو بھول کر اور ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر مجرمانہ غفلت و بے پروائی کے مرتکب ہوئے، جو تاریخ نے انھیں بخشے تھے اور انھوں نے باہمی رقابت، لن ترانی اور احساسِ برتری کے غلط رجحانات سے مغلوب ہو کر عوام کو کنویں اور گہری کھائی کے درمیان لا کھڑا کیا۔

سیاسی رہنماؤں کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے اور بجائے اس کے کہ وہ ملک کے بنیادی مسائل کا حل کرنے کے لیے دوش بدوش مصروف عمل و جدوجہد ہوتے، وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے، حالاں کہ قوم اس خلفشار سے تنگ آ چکی تھی اور اس طرح قومی اور ملی مفادات کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ بیرونی سطح اور عالمی سطح پر ملک کا وقار دن بدن گھٹتا جا رہا تھا۔ بنیادی مسائل سلجھنے کی بجائے اور بھی پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے اور صوبائی تعصب کی وبا نے تیزی سے تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ ایوب خاں کے فیصلے کے بعد ملک میں امن کا دور دورہ ہو جائے گا لیکن کچھ دنوں کے بعد حالات نے پھر وہی صورت اختیار کر لی۔ لیڈروں کے اختلافات تہذیبی حدود کو پھلانگ گئے اور قیادت کرنے والے لیڈر یہ بھول بیٹھے کہ ان کا کام ملک و ملت کے معاملات

اور عوام کی فلاح وبہبود کے لیے کام کرنے بیں ہے ۔وہ معاملات اور مسائل کو گہری نگاہ سے پرکھنے سے قاصر تھے اور مستقبل میں محرومی اور مایوسی وتباہی کا سمبل بن گئے۔

یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ پاکستان وجود میں آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مضبوط اور مرکزی قیادت سے محروم ہوگیا۔ ابھی قیام پاکستان کا مطلب پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ ابتدائی قومی یکجہتی، ایثار پسندی، مخلصانہ گرمجوشی، قومی اتحاد، عزم وعمل اور محبت واخوت کے اعلیٰ جذبات پر صوبائی وعلاقائی تعصبات وشبہات، گروہی مفادات وذاتیات اور ہوس زر واقتدار غالب آگئے اور جو کچھ کسر باقی بچی تھی وہ ایوبی دور میں پوری ہوگئی اور باقی کسر یحییٰ دور میں انتہا پذیر ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں سیاسی عدم استحکام، جمہوریت کی ناکامی اور آئینی بحران جیسے المناک واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ حکومت پر اکثر وبیشتر کوتاہ اندیشی وآمرانہ ذہنیت کے مالک عناصر اور ان کے آلۂ کار وبے لگام نوکر شاہی نے اپنا تسلط جما لیا اور اس افراتفری میں ملک کے مسائل کا خاطر خواہ طور پر حل ہونا تو درکنار الٹا نئے مسائل اور نئی نئی مشکلات کا ایک ہجوم برپا ہوگیا۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں رشوت ستانی، سرکاری لین دین وخرید وفروخت اور کارگزاری میں غفلت وکوتاہی، بددیانتی، کنبہ پروری کی عام وبا پھیل گئی۔ کارخانہ دار، بڑے صنعت کار اور تاجروں کو مفاد عامہ کے خلاف ذخیرہ اندوزی، اشیاء خوردنی میں گھٹیا اور مضر اجزا کی ملاوٹ، مزدوروں سے ناانصافی اور ہر جائز او رناجائز طریقے سے دولت سمیٹنے اور جائیداد بڑھانے کی لت پڑ گئی۔ ایک طرف روز افزوں مہنگائی اور اس پر استحصالی عناصر کی سنگدلی، جس نے غریب عوام بالخصوص کسان، مزدور اور غریب ملازمین کی کمر توڑ دی اور دوسری طرف عیاشی، فحاشی، وحشیانہ جرائم اور انسانیت سوز مذموم رجحانات ترقی کرنے لگے ہیں آج جب ماضی کی یادوں کو کریدتا ہوا سوچتا ہوں کیا ہم ماضی

کے تمام تجربات کو نظر انداز کر چکے جنہوں نے ہمیں سبق دیا تھا کہ کس طرح برطانوی حکمرانوں کے معاندانہ عزائم اور ہندوستان کے کروڑوں متعصب ہندوؤں کے زہریلے عزائم کو خاک میں ملا کر ہم نے ایک نئے ملک کی بنیادیں رکھی تھیں ؟

ماضی اپنی تمام تر تلخیوں کے باوجود حسین ہوتا ہے، اگر ہمارے اپنے ملک کا ماضی کتنا تلخ اور کتنا کسیلا ہے جس میں نہ تلخیوں کا نشہ ہے، نہ یادوں کے کانٹوں کی دلربا چبھن ـــ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور مشرقی پاکستان یاس اور آس کا شکار ہو گیا۔ بنگلہ دیش بنواؤ کی تحریک دن بدن جوان ہوتی چلی گئی اور پھر وقت نے نئی کروٹ لی، بھارت نے اسے نیا رنگ، نیا خون دے دیا۔ پھر وہ منحوس وقت بھی آ گیا جو کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم المیہ کے نام سے یاد رہے گا۔ سرخ اور تازہ خون پانی کی طرح بہا۔ ظلم وستم کے افسانوں کو نئے عنوانات ملے، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ بربریت کے مظاہرے کھلے عام ہوئے جسے دیکھ کر کائنات تک لرز لرز گئی۔ تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا۔ انسانوں کے ہجوم میں میر صادق اور میر جعفر پھر اُبھر آئے۔ آمریت کے ناگوں نے فرعونوں کی شکل اختیار کر لی اور پھر خون رنگ شام تاریخ کے سینے پر بکھر گئیں۔ لوگ خون کے آنسو رو دیئے ـــ ہمارا اپنا گھر ہماری اپنی زمین ـــ زمین جس کے سینے سے سونا اگلتا ہے، جو ہماری ماں ہے۔ دو حصوں میں منقسم کر دی گئی ـ برلن کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو گئی۔ ہمارا ریڈیو ڈھاکے کا حزنیہ الاپتا رہا۔ بی۔ بی سی کی بار بار کارستانی دی "نوّے ہزار افواج نے ہتھیار ڈال دیے"۔ عوام کے دل ڈوب گئے۔ لوگ صدمے سے بے ہوش ہو گئے۔ اف خدا! کیا کسی قوم کی اس انداز میں اتنی بڑی تذلیل ہوتی ہے ؟

یحییٰ حکومت نے آخری تیر پھینکا۔ "پاکستان ایک امن پسند ملک ہے۔ ہمارا

موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ مسئلے جنگ سے حل نہیں ہوتے، اس لیے ہم نے بھارت کی یکطرفہ جنگ بندی کی پیشکش کو منظور کرتے ہوئے افواج پاکستان کو یہ حکم دیا کہ وہ آج شام ساڑھے سات بجے سے جنگ بند کر دے۔"

انفارمیشن سے پریس ریلیز شائع کیے گئے: "سقوطِ ڈھاکہ کو عارضی شکست کہا جائے۔ صدر یحییٰ کی تقریر کی شہ سرخی شائع کی جائے، جنگی حکمتِ عملی (WAR STRATEGY) پر اعتراض نہ کیا جائے، چین اور امریکہ پر تنقید نہ کی جائے اور صدر صاحب کی تقریر کی حمایت میں اداریے لکھے جائیں۔"

ہمارے قومی پریس نے آمرانہ دباؤ میں آکر یہ کوشش کی، مگر جو ہو چکا تھا وہ ایک تلخ حقیقت تھی اور حقیقت کو کہاں تک جھٹلایا جا سکتا ہے۔ زخم کو ڈھانپا جائے تو اور بھی شدت سے ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔

ان تمام باتوں نے عوام کو جھنجوڑ ڈالا، کیونکہ گزشتہ شب آغا محمد یحییٰ خاں نے اپنے مخصوص لہجے میں تقریر کرتے ہوئے قوم سے کہا تھا، "جدوجہد آزادی کی یہ شمع ہم کسی قیمت پر گل نہیں ہونے دیں گے۔ میرے ہموطنوں دشمن کی راہ میں سیسہ پلائی دیوار بن جاؤ۔"

طلوع

اور پھر انسانوں کے ہجوم سے ایک آواز ابھری۔ وہ آواز سابقہ آوازوں کی طرح بھاری بھرکم نہیں تھی۔ وہ آواز تاثراتی بھی نہیں تھی۔ یوں جان پڑتا تھا کہ عوام میں سے ایک مرد جوان اپنے بچوں کے زخموں کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا ہے۔ تڑپ اٹھا ہے۔ یہ آواز درد میں ڈوبی ہوئی مخلص، خالص عوامی آواز تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو ۔ سورج کی طرح یاس و آس کی اندھیری رات میں طلوع ہوئے اور دھوپ کی طرح ہر سو پھیل گئے۔

کل اور آج میں کتنا تضاد تھا۔ کل لڑنے کا عزم اور آج سرنگوں ہونے کی خواہش۔ پوری قوم بے اعتمادی اور بے یقینی کی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ ۱۷ دسمبر اور ۲۰ دسمبر تک لوگوں کے دلوں میں جذبات کے شعلے بھڑکتے رہے۔ راولپنڈی، کراچی، لاہور اور تمام دوسرے شہروں میں جلوس نکالے گئے۔ "ہم یہ شکست تسلیم نہیں کرتے، خون کا بدلہ خون، دشمن کو کچل دو، ہمارے ساتھ غداری ہوئی ہے۔" انتشار بڑھتا گیا اور انتظامیہ فیل ہو گئی اور حالات قابو سے باہر ہو گئے اور لوگ اپنے حواس کھو بیٹھے تو انسانوں کے ہجوم سے ایک آواز ابھری۔ وہ آواز سابقہ آوازوں کی طرح ریڈیائی بھاری بھرکم نہیں تھی۔ وہ آواز تاثراتی بھی نہیں تھی۔ یوں جان پڑتا تھا کہ عوام میں سے ایک مرد جواں اپنے بچوں کے زخموں کو دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے، تڑپ اٹھا ہے۔ وہ آواز مخلص تھی اور درد میں ڈوبی ہوئی۔ وہ آواز عوام کے ہجوم سے ابھری تھی اور خالص عوامی تھی۔ "میرے عزیز ہم وطنو، پیارے دوستو، طالب علمو، مزدورو، کسانو، نوجوانو، پاکستان کے لیے لڑنے والو اور اپنے ہاتھوں سے کام کرنے والو! میں پاکستان کی تاریخ کے ایک اہم اور فیصلہ کن مرحلے میں آیا ہوں۔ ہم اپنی قومی زندگی کے بدترین بحران سے دوچار ہیں، ٹکڑے جمع کرنا ہیں، چھوٹے چھوٹے



یاس و آس کی اندھیری رات میں ذوالفقار علی بھٹو سورج کی طرح طلوع ہوئے اور دھوپ کی طرح ہر سو پھیل گئے۔

ٹکڑے ، لیکن ہم نیا پاکستان بنائیں گے۔ ایک خوش حال، ترقی پذیر، استحصال سے آزاد پاکستان۔ وہ پاکستان جس کے لیے قائداعظم نے کوشش کی تھی۔ جس پاکستان کے لیے برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنی جانوں اور عزتوں کی قربانیاں دی تھیں، وہ پاکستان بنے گا۔ اسے ہر حال میں بننا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے تعاون سے، افہام و تفہیم سے، اور صبر سے ہم ایک مضبوط اور عظیم پاکستان بنائیں گے۔"

اور یہ مخلص آواز بھٹو کی تھی، بھٹو، کسی فرد کا نام نہیں، ایک تحریک ہے۔ عوامی تحریک، عوام کی اپنی آواز ــــ اور یہ قوم کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے اس بحران میں ایک عظیم تر رہنما کو پا لیا۔ رہنما جو جمہوریت کا علمبردار اور قوم کا منتخب نمائندہ ہے۔

جناب بھٹو سورج کی طرح یاس و آس کی اندھیری رات میں طلوع ہوئے اور دھوپ کی طرح ہر سو پھیل گئے۔ اختتامِ جنگ کے بعد ملک میں جو تباہی پھیلی اور نا امیدی کا جو عالم

تھا اسے دیکھ کر یوں احساس ہوتا تھا کہ جیسے خزاں کے ایک ہی جھونکے نے امید کی بہاروں کو بے دردی سے روند ڈالا ہو، مگر جناب بھٹو نے اس نازک ترین دور میں پاکستان کی گرتی ہوئی حالت کو جس تدبر اور عقل و فہم سے سہارا دیا وہ ان کی اعلیٰ دانشمندی اور حب الوطنی کی ایک عظیم مثال ہے۔ بلاشبہ قیام پاکستان کے بعد یہ پہلا موقع ہے جس میں مزدور، کسان، صحافی، قلم کار، دانشوروں اور عام طبقے کے لوگوں کو ان کے جائز مقام دیے گئے ہیں۔

ہر انسان کی حرکات و سکنات کے پیچھے اس کی اپنی خواہشات، اس کی اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کی گہری چھاپ ہوتی ہے جس سے اس کی شخصیت اثر انداز ہوتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے عظیم رہنما ہیں اور ان کے ساتھ پاکستان کی تقدیر وابستہ ہے، پاکستان کے عوام کا مستقبل وابستہ ہے اور ان کی حرکات و سکنات سے برصغیر کی سیاست پہ گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ تو آئیے جناب بھٹو کی نفسیاتی باریکیوں کا تجزیہ کریں جن سے ان کی شخصیت مل کر بنی ہے اور وہ ملک و ملت کے لیے کیا کر رہے ہیں اور ان کی خواہشات کیا ہیں؟

ذوالفقار علی بھٹو کے معتمد خادم شیخ دین محمد عرف بابو نے صدر بھٹو کے بارے میں کچھ حقائق پر سے پردے ہٹائے جن سے صدر بھٹو کی شخصیت کو جانچنے میں مدد ملتی ہے۔

بابو نے صدر بھٹو کو شیر خوارگی، لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور وکالت، وزارت خارجہ اور صدارت کی کرسی پہ بیٹھے دیکھا ہے۔ بابو نے کہا:

"بھٹو صاحب بچپن ہی سے بہت ضدی تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں کرکٹ کا شوق ہو گیا۔ کرکٹ کے بلّے جمع کرنے شروع کیے تو کمرے میں جگہ جگہ بلّے ہی بلّے نظر آتے۔ تقریباً ہر ملک کا ہر قسم کا بلّا موجود تھا۔ اگرچہ عمر میں چھوٹے تھے، لیکن کرکٹ سے لگاؤ

کا یہ عالم تھا کہ اپنے سے کہیں بڑے کھلاڑیوں سے دوستی تھی۔ انھیں اپنے گھر پر دعوت دیتے۔ ان کے دوستوں میں مشتاق علی، گل محمد اور وزیر علی شاہ تھے۔ یہ ان سب سے ایسی باتیں کرتے تھے جیسے ان کے برابر ہوں۔ ان دنوں طالع یار خاں کمنٹری کرتے تھے، یہ کمنٹری سننے کے لیے ان کے ساتھ جا بیٹھتے اور بڑے غور سے کمنٹری سنتے۔ بعض اوقات طالع یار خاں کی طرح خود بھی کمنٹری کیا کرتے۔ بچپن ہی سے ان کی زندگی میں سلیقہ تھا۔ اچھے کپڑے پہننے کا بھی شروع ہی سے شوق ہے۔ کرکٹ کے بعد طالب علمی کے دور میں سیاست سے لگاؤ تھا اور شوق کا یہ عالم تھا کہ محمد علی جناح کے جلسوں میں بڑے شوق سے جاتے تھے۔ ان دنوں قائد اعظم بمبئی میں رہتے تھے اور سر شاہنواز کا گھر ان کے بالکل قریب تھا، اس لیے اکثر قائد اعظم سے ملاقات رہتی۔ اس طرح بچپن ہی سے سیاست سے گہری دلچسپی ہو گئی۔ طالب علمی کے زمانے میں اکثر اوقات طلبہ کے جلسوں میں شرکت کرتے اور تھوڑی بہت تقریر بھی کر دیتے، لیکن بڑے جوش کے ساتھ۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے ہے اور طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی لائبریری میں بے شمار کتابیں موجود رہیں۔

جب بھٹو صاحب کیلی فورنیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی، پاکستان قایم ہو رہا تھا۔

پاکستان کے قیام کے تین ماہ بعد کراچی پہنچے۔ ان دنوں کیلی فورنیا سے جو خطوط تے ان میں پاکستان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوتا۔ پاکستان بنانے کے لیے جو گ جدوجہد کر رہے تھے انھیں سلام بھیجتے۔ اس عرصے میں دو مرتبہ یہاں آئے بھی تین یں بعد آکسفورڈ چلے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں بڑے صاحب کے ساتھ میں لندن گیا تھا۔ ان دنوں صاحب لینسگٹن میں ایک عالی شان فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس فلیٹ میں و ہزار سے زائد کتابیں نظر آتی تھیں۔ آخری رات تک کتابیں پڑھتے رہتے، صبح اڑھائی



جناب ذوالفقار علی بھٹو، بچپن کی ایک یادگار تصویر

بجے سوتے۔ جس محنت سے یہ دن رات پڑھتے رہتے تھے میں اسے دیکھ کر دُعا کرتا تھا کہ ایک دن یہ بھی ایک قابل لیڈر بنیں۔

۱۹۵۳ء میں وطن واپس آئے۔ اس وقت وہ ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے واپس آئے تھے۔ ان دنوں بڑے صاحب سر شاہنواز کے وکیل اور سیاست داں دوست ان سے ملنے آتے جاتے رہتے تھے، سندھ کے سیاست داں جن میں سر غلام حسین ہدایت اللہ، پیر الہٰی بخش، عبدالستار پیرزادہ شامل تھے۔ اسکندر مرزا بھی کبھی کبھار آتے تھے، بھٹو صاحب کے ان دنوں کراچی میں دوست بہت کم تھے۔ جب بھٹو صاحب کامرس منسٹر تھے ان دنوں ان کا بچپن کا دوست پیلو مودی ایک مرتبہ آیا اور ان ہی کے گھر مہمان ٹھہرا تھا۔

صدر بھٹو اصولوں کی خاطر وزارت خارجہ سے الگ ہو گئے اور کراچی چلے آئے۔ کراچی میں ان کے پاس چند ایک حضرات ہی آتے تھے۔ اصغر خاں تو ان ہی کی وجہ

سے جو کچھ ہیں بنے۔ عبدالحفیظ پیرزادہ، قاسم پٹیل، معراج محمد خاں شروع شروع میں آتے تھے۔ آہستہ آہستہ بہت سے لوگ آنے شروع ہو گئے۔ پھر پارٹی بنی۔ باہر سے غلام مصطفیٰ خاں کھر، شیر پاؤ، میر رسول بخش تالپور، عبدالوحید کٹپر آتے تھے۔ معراج محمد خاں کے ساتھ بہت سے طالب علم بھی آتے تھے۔ بھٹو صاحب طالبعلموں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ان سے دیر تک باتیں کیا کرتے تھے۔"

بابو نے جناب بھٹو کی نجی زندگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا:

"صاحب تمام بچوں سے ایک جیسی محبت کرتے ہیں۔ نوکروں کے ساتھ صاحب کا برتاؤ بہت اچھا ہوتا ہے۔ غصہ آ بھی جائے تو دو منٹ سے زیادہ نہیں رہتا۔ صاحب کو غصہ اس وقت آتا ہے کہ جب کسی سے کوئی کام کرنے کو کہا اور وہ کام وقت پر نہیں ہوا۔ لیکن غصہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ نپولین کے بارے میں کتابیں بہت پسند کرتے ہیں۔ سیاست صاحب کا خاص موضوع ہے۔

صاحب جب بھی باہر سے آتے ہیں تو بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے ہیں، مگر یہ صرف اس وقت جب وہ سرکاری عہدے پر تھے۔ وزارت کے زمانے میں وہ کچھ نہیں لائے۔ سرکاری طور پر جو تحفے وغیرہ ملے وہ بھی گھر پر نہیں رکھے۔ اچھے سوٹ پہننے کا بہت شوق ہے۔ کار رف (تیز) ڈرائیونگ کرتے ہیں، مگر آج تک خدا کا شکر ہے کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ سائیکل چلانا بھی آتا ہے۔ بڑے صاحب نے غریب، یتیم بچوں، ضعیف لوگوں اور بیواؤں کے خفیہ طور پر وظیفے مقرر کر رکھے تھے، صاحب نے بھی اس سلسلے کو قائم رکھا ہے، مگر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ صدر سوکارنو کی صاحب سے گہری دوستی تھی۔ انھیں بہت یاد کرتے ہیں اور ان کا ذکر کرتے ہوئے صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے ہیں۔"

جس نازک موڑ پر بھٹو صاحب نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی وہ دور دنیا کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو برصغیر کی ایسی دلربا شخصیت بن گئے ہیں کہ تمام دنیا کے اہل سیاست کی نظریں ان پر ٹکی ہوئی ہیں۔

ہندوستان کی سوتنترا پارٹی کے سربراہ پیلو مودی بھٹو صاحب کے بچپن کے دوست ہیں۔ انھوں نے بمبئی کے ایک اسکول میں ساتھ ساتھ تعلیم پائی۔ امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ایک ہی کمرے میں ساتھ ساتھ رہے، دونوں نے ساتھ ساتھ کھیلوں میں حصہ لیا، طویل چھٹیاں تفریحی مقامات پر ایک ساتھ گزاریں۔ مختلف موضوعات پر بحثیں کیں۔

بچپن ہی سے دونوں کے نظریات میں گہرا اختلاف تھا، مگر اس کے باوجود ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پیلو مودی آج بھی ذوالفقار علی بھٹو کو بچپن کے پیار کے نام سے "زلفی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ انھوں نے بھٹو صاحب کی سوانح حیات بھی لکھی ہے۔ اس کا نام بھی انھوں نے "زلفی میرا دوست" رکھا ہے۔[1]

مسٹر مودی بھی بھٹو صاحب کے بارے میں بڑی خوبصورت رائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "زلفی میرے بہترین دوست رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، اس لیے نہیں کہ وہ ایک معقول انسان ہیں، اس لیے بھی نہیں کہ وہ ایک متوازن اور انصاف پسند ذہن کے مالک ہیں، اس لیے بھی نہیں کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم ہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ وہ زلفی ہیں۔ اپنے دوستوں کے تئیں وفادار، پیار اور گرم جوشی سے بھرپور، اپنے دوستوں کی کمزوریوں کو نظرانداز کرنے والے، رواداری اور پُر خلوص۔ درحقیقت میری ابتدائی زندگی کے چھ سالوں میں ۱۸ سے ۲۴ سال کی عمر تک ان کی شخصیت نے ایک اہم رول ادا کیا ہے ــــ ۱۹۳۷ء کی بات ہے، میری عمر دس برس تھی اور زلفی

[1] شبستان ڈائجسٹ نئی دہلی

نو برس کے تھے۔ ہم دونوں بمبئی کے کیتھڈرل پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ ایک دن میں اسکول میں زینے سے نیچے اتر رہا تھا۔ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا مجھ سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے آگے بڑھنے سے روک دیا اور کہا، "دیکھتے نہیں میں جا رہا ہوں"۔ وہ لڑکا میرے بھاری بھر کم وجود کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا اور میرے پیچھے چلنے لگا۔ یہ لڑکا تھا " ذوالفقار علی شاہنواز بھٹو"۔

پھر مجھے تعلیم کے سلسلے میں دہرہ دون کے دون اسکول جانا پڑا۔ پانچ سال کے بعد جب میں بمبئی واپس آیا تو زلفی کافی بڑے ہو گئے تھے۔ وہ سینیئر کیمبرج کی تیاری کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ دبلے پتلے تھے مگر ان کی آواز کافی موثر تھی۔ وہ ایک بارعب آواز کے مالک تھے۔ اس زمانے میں ان کی صحبت میں بڑا پرلطف وقت گزرتا تھا۔ ہم چھٹیوں میں مختلف کھیل کھیلتے تھے۔ صبح ساڑھے سات بجے ٹینس کھیلتے۔ اس کے بعد کچھ وقت سوئمنگ پول میں تیرتے اور دوپہر تک پانی میں کھیل کھیلتے رہتے۔ زلفی اکثر دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد کبھی کبھی کوئی فلم دیکھنے چلے جاتے۔ رات کے کھانے کے بعد زلفی میرے گھر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے سیٹی بجاتے اور میں باہر نکل کر ان کے ساتھ چہل قدمی کے لیے چل دیتا۔ آدھی رات تک ہم یوں ہی گھومتے رہتے۔ ہر قسم کے فکرات سے آزاد۔ یہ بڑے مزے کی زندگی تھی۔ ہم مختلف منصوبے بناتے اور پھر ان کو رد کر دیتے۔ کبھی کوئی فرم کھولنے کی بات کرتے۔ کبھی کسی پیشے کے نشیب و فراز پر غور ہوتا۔ ایک دفعہ تو زلفی اور میں نے اپنے ایک تیسرے دوست رام لال لالوانی کے ساتھ کپڑے کی دکان کھولنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر دوسرے تمام منصوبوں کی طرح یہ بھی ایک خیالی محل رہا۔ ہمارے دوستوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ تمام بحث مباحثوں اور تفریحات میں زلفی میرا ساتھ دیتے

تھے، لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں ان کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا۔ تب زلفی بہت ناراض ہوتے تھے۔ ہم دونوں کو جب اکیلے رہنے کا موقع ملتا زلفی بیشمار موضوعات پر گفتگو کرتے۔ ان کے کسی موضوع کے بارے میں جاننے کی بے پناہ خواہش رہتی تھی۔ ہر چیز کی تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ ان کا حافظہ بھی کافی تیز تھا۔ مختلف موضوعات جیسے تاریخ، فلسفہ، ادب، موسیقی، آرٹ، سیاست اور معاشیات کے بارے میں معمولی معمولی باتیں بھی یاد رکھتے تھے۔ ہم ان کتابوں پر بھی تبادلۂ خیال کرتے تھے جو ہم پڑھتے تھے، لیکن ایک بات میں سمجھنے سے قاصر رہا کہ باوجود ذہین ہونے اور ایک تیز حافظہ رکھنے کے زلفی سینئر کیمبرج کے امتحان میں ناکام ہو گئے۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ زلفی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس لڑکی سے سچے دل سے پیار کرتے تھے، لیکن لڑکی سے زیادہ وہ اس تصور سے پیار کرتے تھے کہ وہ عشق میں گرفتار ہیں۔ زلفی بڑے غمگین رہتے تھے، کیونکہ لڑکی کے والدین لڑکی کو ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ زلفی لڑکی سے ملنے کے منصوبے بنانے، طرح طرح کی اسکیمیں سوچتے، سازشیں کرتے، تاکہ وہ چند لمحے اپنی محبوبہ کے ساتھ گزار سکیں۔ یہ بڑا المیہ تھا کہ زلفی اس پیار کے سلسلے میں بڑے سنجیدہ اور مخلص تھے اور وہ لڑکی کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ کافی عرصے تک وہ اس کی یاد کو اپنے دل سے نہیں بھلا سکے۔

۱۹۴۹ء کی بات ہے جب زلفی امریکہ پہنچے جہاں انھوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ میں وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہم نے یونیورسٹی سے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت مکان کرائے پر لیا تھا اور ہم ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ کچھ اور ہندوستانی طلبہ بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ ہم نے آپس میں کاموں کو تقسیم کر رکھا تھا۔ میں کھانا پکاتا تھا زلفی کے ذمے گھر کی صفائی اور بستر لگانا تھا۔ ان ہی دنوں وینا سے میری ملاقات ہوئی جو بعد میں میری بیوی بنی۔ وینا زلفی ہی کی طرح تھی، ہر وقت کام کے لیے آمادہ، کسی بھی

مہم میں حصہ لینے کے لیے تیار، وفادار، گرم جوش، وسیع القلب۔

ایک دفعہ میری زلفی سے لڑائی ہوئی۔ میں نے ان سے بات چیت کرنا بند کردی، مگر زلفی کا نظریۂ دوستی بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر صورت میں دوستی نبھانے میں یقین رکھتے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مجھ سے زیادتی ہوئی تھی، مگر زلفی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ برابر میرے بستر اور کپڑوں کو درست کرتے تھے، جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ زلفی میں یہ بہت بڑی اور پیاری خوبی تھی کہ ایک بار جب کسی سے ان کا تعلق قائم ہوجاتا ان کے پیار میں کبھی کمی نہیں آتی تھی۔

زلفی اس زمانے میں اپنے لباس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لباس کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا جاتا تھا۔ ہر نیا لباس پہننے پر اپنے دوستوں سے پوچھتے تھے کہ وہ اس لباس میں کیسے لگ رہے ہیں؟ اس کے ساتھ اپنی گفتگو میں بھی وہ خوبصورت زبان بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان دونوں خوبیوں نے ان کو پر وقار اور دلکش شخصیت کا مالک بنادیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں کافی مقبول تھے۔ اسی زمانے میں ان کے سوشلسٹ نظریات پختہ ہوئے۔ اگرچہ وہ کہتے تھے کہ سوشلزم سے ان کا لگاؤ بہت پرانا ہے۔ سوشلزم کے بارے میں ان کے تصورات کی بنیاد ان کے آبائی وطن سندھ کی غریبی تھی۔ تاہم زلفی نے ہیرالڈ لاسکی کے بہت سے لیکچر سنے تھے اور ان کی مشہور کتاب "گرامر آف پالیٹکس" کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اسی دوران زلفی نے کیلی فورنیا یونیورسٹی میں اسلام پر ایک تقریر کی تھی جس میں مسلم ممالک میں سوشلزم کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ باہمی گفتگو میں ایک دفعہ زلفی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ نہرو کے سوشلزم سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔"

مسٹر پیلو مودی نے ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں ایک دلچسپ انکشاف کرتے ہوئے کہا، "زلفی اکثر یہ بات کہتے تھے کہ وہ اپنے ملک کی سیاست میں ایک

نہ ایک دن ضرور کچھ نہ کچھ بن کر رہیں گے اور ان کی تمام ترجد وجہد اسی مقصد کے لیے ہے۔
۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے دوران تمام دنیا کی نظریں اقوام متحدہ کی امن کے سلسلے میں کوششوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ان دنوں وہ یہ تمنا کرتے تھے کہ ایک دن اسمبلی میں وہ اپنے ملک کے نمائندے بن کر آئیں گے۔ ان کا یہ خواب پورا ہوا۔ یہی نہیں، بلکہ وہ ۴۴ سال کی عمر میں ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کے صدر بھی بن گئے۔"

ذوالفقار علی بھٹو ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ وہ بچپن ہی سے ملک اور قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے اور جبکہ خدا نے انھیں یہ موقع عطا فرما دیا اور وہ ملک اور قوم کے مسائل حل کرنے میں سرگرداں ہیں۔ وہ ان تمام مسائل کو تیزی سے حل کرنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ روزانہ بیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام وہ خود ہی انجام دیتے ہیں۔ وہ جمہوریت کے علمبردار ہیں اور ان کی یہی کوشش رہی ہے کہ ملک کے ہر طبقے اور ہر صوبے کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہو اور تمام لوگ ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر حصہ لیں، تاکہ ملک ترقی کرے اور افسردہ چہروں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھیں۔

پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوری ملک میں حزب اختلاف بھی حکومت کا جزو ہوتی ہے اور حکومت اور حزب اختلاف کے امتزاج سے کسی بھی خوش حال حکومت کا تاثر ابھرتا ہے۔ حکومت اپنے پروگرام اور پالیسی کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلاتی ہے اور حزب اختلاف اپنی صحت مندانہ تنقید سے حکومت کو غلط راستے پر جانے سے روکتی ہے اور سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ہمارے ملک کی ہمیشہ سے یہ بدقسمتی رہی ہے کہ ہر حکومت میں حزب اختلاف نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے جس سے حکومت کے بنے بنائے کاموں میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور تشدد کا راستہ اختیار

کیا گیا اور ملک میں بدامنی، انتشار پھیلایا گیا، لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی پُروقار و پُربہار شخصیت نے حزبِ اختلاف کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور حزبِ اختلاف کی انتہا پسند جماعتوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا اور مروّجہ قانون کی پوری پابندی کی اور یقیناً اقتدار کی منتقلی کا اس وقت یہی ایک طریقہ تھا۔ حزبِ اختلاف نے نعرہ بازی کی۔ نعروں اور جلسوں سے بھی کام نہ بن سکا تو حکومت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر دیا۔

حکومت حزبِ اختلاف کی اس چال سے پوری طرح باخبر تھی اس لیے بھٹو صاحب نے جمہوری دستور کی منظوری تک مارشل لا جاری رکھا اور عدالتِ عالیہ سے اپنی حکومت کی بابت آئینی جواز کا فیصلہ ہونے سے قبل ہی قومی اسمبلی سے دستور منظور کرالیا اور اس دستور کو اتفاقِ رائے سے منظور کیا گیا۔ نتیجتہً مارشل لا ختم ہو گیا اور حزبِ اختلاف کو منھ کی کھانی پڑی اور اس طرح سے پاکستان میں گزشتہ ۱۴ سال تک غیر نمائندہ ملٹری ڈکٹیٹر نے حکومت کی آمرانہ روش اختیار کی ہوئی تھی، اسے بدل ڈالا اور عوام کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل پہلی قومی اسمبلی بلائی اور اس طرح قومی اسمبلی کا انعقاد جمہوریت اور ترقی کی طرف پہلا قدم تھا۔

قومی اسمبلی کے لیے پاکستان کے آئین کی تدوین اور اتفاقِ رائے سے منظوری کی خبر اہلِ پاکستان کے لیے ایک تاریخی اور مسرت انگیز خبر تھی۔ اس ملک خداداد پاکستان کے ساتھ یہ ایک بڑا المیہ رہا ہے کہ ۲۵ سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی قابلِ عمل آئین قوم کو نہ مل سکا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین جو عوام کے منتخب نمائندوں کی کاوش کا نتیجہ تھا اسے مارشل لا کی ضرب نے پاش پاش کر دیا تھا اور

ایک آمر کے غیر جمہوری آئین نے قوم کو بنیادی جمہوری حقوق سے محروم کر رکھا تھا ہر شعبہ میں استحصال کیا گیا۔ نیا آئین وقت کی ایک اہم ضرورت تھی، چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۷۳ء کو نیا آئین دے کر بھٹو صاحب نے عوام کے مردہ جسموں اور سوئے ہوئے ذہنوں میں امید کی ایک نئی کرن کو بیدار کر دیا۔

ہمارے اپنے ملک کا ایک بڑا المیہ یہ بھی رہا ہے کہ یہاں سیدھے سادھے مسئلے بعض اوقات تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتے ہیں جن سے بڑے بڑے طوفان جنم لیتے ہیں۔ مارشل لا کا وجہ نزاع بنا ایک مسئلہ تھا جس نے تکلیف دہ صورت اختیار کر لی اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی تھی، کیوں کہ الیکشن ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئے اور اسمبلی کا اجلاس اپریل ۱۹۷۲ء میں منعقد ہوا۔ اتنے طویل عرصہ میں کچھ بات بنی نہیں اور اس سلسلے میں کچھ بھی نہ ہو سکا اور مارشل لا قائم رکھا گیا۔ قومی اسمبلی کے ارکان بھی کچھ نہ کر سکے۔ اپوزیشن نے قومی اسمبلی سے واک آؤٹ کیا اور مارشل لا کے خلاف مظاہرے بھی کیے۔ صوبہ سرحد و بلوچستان کی نئی پارٹیاں نیپ (ولی گروپ) اور جمعیۃ علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) بضد تھیں کہ مارشل لا کی موجودگی میں حکومت سے تعاون نہیں کیا جا سکتا اور دوسرے متعدد سیاست دانوں کا بھی یہی خیال تھا کہ مارشل لا فوری طور پر ختم کیا جائے۔ قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے اور قومی اہمیت کے فیصلے وہیں کیے جائیں۔ دوسری طرف حکومت کا کہنا یہ تھا کہ اصلاحات کے فوری نفاذ کے لیے مارشل لا کا سہارا ناگزیر ہے، خاص طور پر زرعی اصلاحات کے نفاذ کا عمل چونکہ ۱۹۷۲ء تک ختم ہونا تھا اس لیے مارشل لا کو ۱۴ اگست تک رکھنا ضروری ہے۔ ان تمام مسائل کے باوجود بھٹو صاحب نے قومی اسمبلی میں اپنی طویل تقریر کے بعد ڈرامائی انداز

میں مارشل لا کے ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء سے بہت پہلے ۲۱ اپریل کو خاتمے کا اعلان کر دیا۔ خان عبد الولی خان نے اسے گزشتہ ۲۵ برس میں سب سے اہم خبر قرار دیا اور مفتی محمود کا کہنا تھا کہ اس اعلان سے بھٹو صاحب نے عوام کے دل جیت لیے ہیں اور حزبِ اختلاف کی تمام پارٹیوں نے بھی بھٹو صاحب کے اس اقدام کو سراہا۔

گزشتہ جنگ ۱۹۷۱ء میں دشمن کے پروپیگنڈے نے بیرون ملک میں پاکستان کے وقار کو مسخ کر دیا تھا۔ بھٹو صاحب کے سامنے بڑا مسئلہ اقوام عالم کی نظر میں پاکستان کے وقار کو بلند کرنا تھا۔ یہ ایک خوبصورت حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب کو بین الاقوامی سیاست پر پورا اور مکمل عبور حاصل ہے، چنانچہ بھٹو صاحب نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد ہی اسلامی ممالک کا تیرہ روزہ طوفانی دورہ کیا اور قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اپنے موقف کی وضاحت کی اور نام نہاد "بنگلہ دیش" کے مسئلے پر تمام عرب ممالک کی حمایت حاصل کی۔ یہ جناب بھٹو کی شخصیت کا ہی جادو تھا کہ انھوں نے صرف ۱۳ دن میں وہ کام کر دکھایا جو ۲۵ سال میں نہ ہو سکا۔

بین الاقوامی سطح پر ہر ملک کے دو پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ داخلہ حالات اور خارجہ تعلقات کی تنظیم کے ذریعے ہر ملک اپنے قومی اتحاد، یک جہتی اور معاشی استحکام کے لیے جدو جہد کرتا ہے، لیکن خارجہ پالیسی کے ذریعے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کیے جاتے ہیں اور اس طرح ملک خارجہ پالیسی کے ذریعے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کرتا ہے اور عالمی برادری میں اپنی حیثیت تسلیم کراتا ہے۔ ہر ملک کی اپنی انفرادی حیثیت اس کی خارجہ پالیسی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ جناب بھٹو کی قیادت میں پہلی مرتبہ پاکستان میں حقیقی معنوں میں عوام کی

نمائندہ قیادت ابھری تو بھٹو صاحب نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو از سر نو مرتب کیا اور ملک کے ایشیا میں کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ سیٹو سے علیحدگی، شمالی ویت نام، شمالی کوریا اور مشرقی جرمنی کو تسلیم کرنے کا فیصلہ خارجہ پالیسی کی کامیابی کی بہترین مثالیں ہیں اور پاکستان خارجہ پالیسی کی ان تبدیلیوں سے بین الاقوامی سیاست اور خاص طور پر ایشیائی سیاست میں ایک نئی اہمیت کے ساتھ ابھر رہا ہے۔

خارجہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جناب بھٹو صاحب نے بیس ممالک کے دورے کیے۔ ان میں ترکی، الجزائر، تیونس، لیبیا، مصر، شام، متحدہ عرب امارات، سوڈان، ماریطانیہ، سومالیہ، نائجیریا، گنی شامل ہیں۔

اس سلسلے میں پاکستان کی طرف سے کئی خصوصی ایلچی بھی بھیجے گئے ابتدائی طور پر جناب بھٹو صاحب نے مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ان دوست ممالک پر توجہ مبذول رکھی جو پاکستان کا ساتھ دے چکے تھے اور جن کی حمایت کی تائید و توثیق نے بیرونی ممالک میں پاکستان کے وقار کو سہارا دیا تھا۔

خارجہ پالیسی کو مستحکم کرنے کے سلسلہ میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جنوری اور مارچ ۱۹۷۲ء میں چین اور روس کے دورے بھی کیے۔ ان دوروں کے نتیجہ میں انھوں نے تین بڑی طاقتوں کے ساتھ دوستی اور تعمیری بنیادوں پر دوطرفہ تعلقات کا مقصد حاصل کر لیا۔

پاکستان امن کا متلاشی ہے اور اپنے ہمسایوں بالخصوص ہندوستان کے ساتھ اپنے اچھے تعلقات قایم کرنے کو بڑی اہمیت دیتا ہے — اسی لیے جناب بھٹو نے "فارن افیرز" ۱۹۷۲ء اپریل کے شمارے میں "پاکستان کی نئی تعمیر" کے

عنوان سے شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں کہا۔ پاکستان کے لیے امن کا مطلب سب سے پہلے یہ ہے کہ ہمسائیگی کی بنیاد پر ہندوستان کے ساتھ تعلقات بحال کیے جائیں۔

چنانچہ جناب بھٹو نے ہندوستان سے بات چیت کے حق میں رائے ظاہر کی اور اپریل ۷۲ء میں مری اور راولپنڈی میں اپنی ملاقات کے دوران پاکستانی اور ہندوستانی ایلچیوں نے دونوں ممالک کے درمیان اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے لیے ایجنڈا اور تاریخ پر اتفاق رائے کا اظہار کیا۔ یہ معاہدہ پاکستان کی دو طرفیت کی عام پالیسی سے ہم آہنگ تھا۔

۲۸ جون ۱۹۷۲ء کو شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے سے قبل جناب بھٹو نے اپنی تقریروں اور بیانات میں واضح کر دیا کہ پاکستان دیرپا امن کے حصول کے لیے ہمیشہ کوشش کرتا رہے گا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست کے بعد قوم کے لیے سب سے بڑا سوال اپنے ملک کے مقبوضہ علاقوں اور جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ تھا۔ جناب بھٹو نے اس مسئلے پر پوری توجہ دی۔ قومی اسمبلی کی منظوری اور حزب اختلاف کے تمام لیڈروں کی رائے لے کر شملہ گئے جہاں انھوں نے ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے مذاکرات کیے۔ یہ وہ لمحے تھے جب برصغیر ایک خطرناک صورت حال سے دوچار تھا۔ سیاسی مبصرین کا خیال تھا کہ اگر بھٹو صاحب کا یہ دورہ ناکام رہا اور مقبوضہ علاقہ واپس نہ مل سکا، جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ حل نہ ہو سکا تو کسی بھی وقت برصغیر میں جنگ کا خوفناک دھواں پھر پھیل سکتا ہے۔

یہ بڑے جذباتی مسئلے تھے اور یہ ایک تلخ حقیقت تھی اور ہے کہ ہمارے

گذشتہ رہنماؤں نے سیاسی غلطیاں کیں جن کی وجہ سے پوری قوم کو ایک المنٹ اور گہرے زخم سے آشنا ہونا پڑا۔ اور جس کی پاداش میں مشرقی پاکستان کے بھائی ہم سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ۹۳ ہزار جوان قیدی بنا لیے گئے اور ہزاروں مربع زمین سے ہمیں ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

اس تاریخی کانفرنس کو کئی نشستوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور دنیا کو یقین ہو گیا کہ یہ تاریخی کانفرنس ناکام ہو گئی۔ مگر آخری لمحوں میں جناب بھٹو کی کاوشیں رنگ لے آئیں اور ڈرامائی انداز سے شملہ معاہدہ تقریباً ایک بجے رات کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ملک میں مایوس لوگوں کے چہرے بدل گئے اور یوں معلوم دینے لگا جیسے اچانک مردہ جسموں میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔ یہ بھٹو صاحب کی شخصیت کا سحر کن پہلو ہے جس نے ہمیں مزید خون خرابے کے بغیر یہ کامیابی عطا کی اور اس طرح امن پسندی، صلح جوئی اور ایک دشمن ملک سے تمام تر تنازعوں کو مفاہمت کے جذبے کے ساتھ طے کرنے کی بنا پڑی اور ہمیں اپنا ہزاروں مربع میل کھویا ہوا علاقہ واپس مل گیا۔ بلاشبہ یہ جناب بھٹو کی جمہوری قیادت ہی کا نتیجہ ہے۔

مجھے وہ دن بھی کبھی نہیں بھولے گا جب بھٹو صاحب معاہدۂ شملہ کی کامیابی کے بعد تشریف لائے۔ ہزاروں انسان اپنے پیارے اور شفیق رہنما کے دیدار کے لیے امڈ پڑے۔ بھٹو صاحب جب طیارے سے اترے تو اپنے آپ کو انھوں نے بے انتہا انسانوں کے ہجوم میں گھرا ہوا پایا۔ یہ وہ عوام تھے جو اپنے عزیز ترین رہنما پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے ایئرپورٹ آئے تھے۔ یہ عوام کی اپنے پیارے اور شفیق رہنما سے عقیدت تھی، محبت تھی۔ بھٹو صاحب خوب اچھی طرح اس محبت کے جذبے سے آشنا تھے، چنانچہ جناب بھٹو نے جذباتی ہو کر اپنا کوٹ خوشی سے

مدہوش ہو کر ہوا میں لہرایا اور عوام کی طرف اچھال دیا۔ عوام نے عقیدت سے صدر کے کوٹ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ وہ اس کوٹ کو عقیدت اور احترام سے اپنے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھے۔ اس کوشش میں کوٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ـــ تمام لوگوں کے دل خوشی کے عظیم جذبے سے سرشار تھے۔ وہ تالیاں بجا رہے تھے اور بھٹو صاحب مسکرا مسکرا کر ہاتھ ہلا کر اپنے عوام کی اس عقیدت کا جواب دے رہے تھے فضا میں آوازیں ہی آوازیں بکھری ہوئی تھیں۔ "بھٹو، زندہ باد" لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ کیا پاکستان کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود ہے جو قائد اور عوام کے اس عقیدت اور پرخلوص رشتے کا اظہار کرتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک خالص عوامی رہنما ہیں اور جس طرح وہ پاکستان کے عوام میں ہر دل عزیز ہیں اس کی مثال برصغیر میں نہیں ملتی۔ وہ پہلے عوامی لیڈر ہیں جو اپنے عوام کو اپنی ہر تقریر میں بڑے خلوص کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں۔ انھیں اپنے بچوں کی طرح پاکستان کے عوام عزیز ہیں۔ یہ تمام خوبیاں ان کی پر بہار شخصیت کا جز ہیں۔ وہ جب بچے تھے تب بھی انھیں اپنے ملک سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ جب طالب علم تھے تب بھی وہ اپنے ملک کے لیے پریشان رہتے تھے اور جب وہ حکومت کے عہدہ دار تھے تب بھی انھوں نے اصولوں کے خلاف آواز بلند کیا تھا اور آج جب کہ وہ وزیر اعظم ہیں۔ آج بھی انھیں غریب عوام کا پورا پورا خیال ہے۔ خلوص کی تاریخ میں شاید چند ہی مثالیں ایسی مل سکیں۔

کرن کرن اُجالا

ایک نیا پاکستان وجود میں آچکا ہے جو اپنی
ہیئت اور بنیادی مقاصد و خصوصیات کی وجہ
سے ہماری نئی سیاسی بصیرت کی عکاسی کرتا ہے۔
ہماری نئی خارجہ پالیسی اس امر کا ثبوت ہے۔
ملک کے اندر حالات کی تیزی سے بحالی، استحکام
کی فضا اور عوامی حکومت کے اقدامات کے نتیجے
سبب ہونے والی سماجی و اقتصادی ترقی بلاشبہ۔

خارجہ پالیسی کے بارے میں حزب اختلاف نے عوام کو ہمیشہ غلط تاثر دینے کی کوشش کی، مگر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی میں اپنی اختتامی تقریر میں وضاحت فرمائی جس سے بجا طور پر خارجہ پالیسی کے بارے میں غلط فہمیاں رفع ہوئیں۔ وزیر اعظم بھٹو نے اس بات کو زبردست غلط فہمی قرار دیا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی ایک بڑی طاقت کے تابع ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اس وقت ایک ایسی خارجہ پالیسی پر کاربند ہے جو پاکستان کی اپنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور یہ پالیسی تین اصولوں پر مبنی ہے۔

(۱) پاکستان کی سالمیت کا تحفظ

(۲) تنازعات کا پرامن ذرائع سے منصفانہ تصفیہ

(۳) ملک کی اقتصادی ترقی

کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کے موثر یا غیر موثر ہونے کا پتہ چلانے کے لیے ان اصولوں کو کسوٹی قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۱ء کا المیہ، پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ جہاں اس المیے کے دوسرے داخلی اسباب تھے ان میں ہماری خارجہ پالیسی بھی تھی۔ ہماری خارجہ پالیسی اتنی موثر نہیں تھی کہ وہ ہماری داخلی غلطیوں کے باوجود پاکستان کو شکست سے بچا لے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی غیر مشروط رہائی سے لے کر پاکستان کا بنگلہ دیش کے سلسلے میں رویہ نہایت منصفانہ رہا۔ پاکستان مصالحت کا اور ان مصائب کو کم کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکا ہے، اس لیے جناب بھٹو نے بنگلہ دیش سے تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے کئی اقدامات کیے۔

۲/ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو وزیر اعظم بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انصاف اور برابری کی بنیاد پر برادرانہ تعلقات کی پیش کش کی۔ اور قریبی برادرانہ تعلقات کی دوبارہ بحالی کی تاکید کرتے ہوئے انھوں نے بنگالیوں سے کہا "وہ ماضی کے واقعات کو فراموش کر دیں جس طرح پاکستان کے عوام نے ماضی کی باتیں بھلا دی ہیں" جناب ذوالفقار علی بھٹو نے یہ اعلان بھی کیا "میں انتہائی خلوص کے ساتھ ان کو چاول اور کپڑا بھیجنے کی پیشکش کرتا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ بنگلہ دیش کے حکام اس پیش کش کو قبول کریں گے۔"

جہاں تک بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا تعلق تھا وزیر اعظم شروع سے ہی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن وہ کئی بار اس امر کی وضاحت کر چکے تھے کہ پاکستان کسی بھی دباؤ کے تحت بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرے گا۔ قومی اسمبلی نے وزیر اعظم کو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لیے اختیار دے دیا اور اسلامی سربراہ کانفرنس کے مبارک موقع پر تمام اسلامی ممالک کے اتفاق رائے پر جناب بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ توقع ہی نہیں، بلکہ یقیناً پاکستان اور ملک کے سابقہ مشرقی حصے کے درمیان تعلقات مستقبل قریب میں بحال ہو جائیں گے۔

پاکستان نے جس طرح دوسرے ہمسایہ ممالک سے اچھے تعلقات استوار کرنے



۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد دستخط کر رہے ہیں۔

کی کوشش کی ہے، اسی طرح پاکستان افغانستان سے بھی اچھے اور خوشگوار تعلقات قایم کرنے کا خواہاں رہا ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے سب سے پہلے جس ملک کا دورہ کیا تھا وہ افغانستان تھا۔ پاکستان ٹرانزٹ، ٹریڈ ایگریمنٹ کی صورت میں افغانستان کی ٹرانزٹ ٹریڈ کے لیے ہر ممکن سہولتیں فراہم کرتا رہا ہے۔ ۶ر اگست ۱۹۷۲ء سے افغانستان سے ہندوستان کو ہوائی سروس سے تازہ پھل بھیجنے کی بھی اجازت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۷۳ء کا انقلاب جس کے نتیجے میں شاہ ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور ان کی جگہ سردار محمد داؤد خاں افغانستان

کے صدر مقرر ہوئے۔ افغانستان کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات پر ذرا بھی اثر انداز نہ ہوا، اس لیے کہ پاکستان نے نئی حکومت کو تسلیم کر لیا، مگر یہ بات قابلِ افسوس رہی کہ پاکستان کے مذکورہ بالا دوستانہ تعلقات اور جذبۂ خیر سگالی کے باوجود سردار داؤد نے صدر کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں نام نہاد پختونستان کے مسئلہ کا حوالہ دیا اور مسٹر نیاک دوبار اس مسئلے کو اٹھا چکے ہیں۔ ایک غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس میں اور دوسری مرتبہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں، اس لیے پاکستان نے اپنے داخلی معاملات میں اس کھلم کھلا مداخلت پر حکومتِ افغانستان سے شدید احتجاج کیا۔

پاکستان کا دوسرا قریبی ہمسایہ ملک ایران ہے۔ ایران سے پاکستان کے تعلقات جناب ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری قیادت میں مزید مستحکم ہوئے۔ شاہ ایران پہلے سربراہ مملکت تھے جنہوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے فوراً بعد پاکستان کا دورہ کیا۔ صدر کی حیثیت سے جناب بھٹو تین مرتبہ ایران کے دورے پر تشریف لے گئے۔ ۱۹۷۳ء کے دوران دونوں سربراہوں نے دوروں کا تبادلہ کیا اور باہمی مفاد اور بین الاقوامی صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ پاکستان اور ایران کے درمیان دو طرفہ بنیاد پر اور آر۔ سی۔ ڈی کے زیرِ اہتمام تعاون کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ پاکستان اور ایران کے مشترکہ صنعتی اور دیگر نوعیت کے منصوبے اس بڑھتے ہوئے تعاون کی زندہ مثال پیش کرتے ہیں۔

آر۔ سی۔ ڈی۔ کے رکن ملک ترکی کے ساتھ پاکستان کے تعلقات ۱۹۷۲ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اس برادر ملک میں دوروں کی وجہ سے مزید مضبوط ہو چکے ہیں۔ ترکی نے سرزمائش کے لمحے میں پاکستان کا ساتھ دیا اور ۱۹۷۱ء کے

بحران کے دوران اور پاکستانی جنگی قیدیوں کے مسئلے میں اس نے پاکستان کی بھرپور امداد کی۔

پاکستان اور برصغیر جنوبی ایشیا کے دو چھوٹے ممالک نیپال اور سری لنکا کے درمیان تعلقات ہمیشہ سے پرتپاک اور دوستانہ رہے ہیں۔ ایک ہی برصغیر میں واقع دو بڑی طاقتوں کے سائے میں وجود رکھتے ہوئے دونوں ممالک یعنی پاکستان اور نیپال شروع ہی سے ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں۔

نیپال نے پاکستانی جنگی قیدیوں کے سلسلے میں جنیوا کنونشنز پر عملدرآمد کے حق میں رائے ظاہر کی تھی۔ ایک دوسرے کے مسائل اور پالیسیوں کی افہام و تفہیم اور باہمی تعاون پاکستان اور سری لنکا کے تعلقات ایک نمایاں خصوصیت رہے ہیں حکومت سری لنکا نے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں جنیوا کنونشنز کے اصولوں کی تائید کی تھی۔ ماضی قریب میں پاکستان اور سری لنکا کے درمیان تجارت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری عوامی حکومت نے عرب ممالک اور افریقہ کے ساتھ تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کے لیے خصوصی کوششیں کیں۔ جناب بھٹو نے ۱۹۷۲ء میں عرب اور افریقی ممالک کا دورہ کیا اور پاکستان نے اقوام متحدہ کے اندر اور باہر عرب اور افریقی عوام کے منصفانہ موقف کی حمایت کی اور اب پاکستان اور عرب ممالک کے درمیان اقتصادی اور فنی تعاون کی نئی راہیں تلاش کی جا رہی ہیں۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں جناب بھٹو نے کویت کا دورہ کیا اور امیر کویت سے مشرق وسطیٰ کی صورت حال اور پاکستان میں مجوزہ اسلامی کانفرنس سے متعلقہ مسائل اور باہمی اقتصادی تعاون پر بات

چیت کی۔ امیر کویت نے پاکستان کو تیل کی بغیر خلل کے سپلائی جاری رکھنے کا یقین دلایا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو اسرائیل اور قریبی عرب ریاستوں کے درمیان جنگ سے پاکستان میں تشویش کا اظہار کیا گیا۔ جناب بھٹو نے تمام عرب سفیروں کو پاکستان کے مسلسل اتحادِ عمل کا یقین دلایا۔ انھوں نے مصر اور شام کے صدر کو پاکستان کی مکمل حمایت اور ان کے جائز موقف پر ان کی کامیابی کے دعائیہ پیغامات بھجوائے۔ یو این او کے سکریٹری جنرل کے نام ایک پیغام میں وزیر اعظم نے اس امر پر زور دیا کہ ۱۹۶۷ء کی قرارداد ۲۴۲ کے مطابق عرب علاقوں کو خالی کرانے کے لیے سلامتی کونسل کو فوری اقدامات کرنے چاہئیں۔ یو۔ این جنرل اسمبلی میں وزیر مملکت برائے دفاع و امور خارجہ نے بھی ۱۹۶۷ء کی قرارداد پر فوری عمل درآمد پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بھی یاد دلایا کہ کوئی بھی تصفیہ فلسطینی عوام کے جائز حقوق کی بحالی کے بغیر دیرپا ثابت نہیں ہو سکتا۔

وزیر اعظم نے مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال پر غور کرنے کے لیے ۱۱ اکتوبر کو چیف آف اسٹاف کی ایک میٹنگ بلائی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ پاکستان اپنے محدود وسائل کے دائرے میں عربوں کی ان کے جائز موقف پر حمایت کرے گا۔ لہٰذا اسی روز یہ بھی اعلان کیا گیا کہ پاکستان فوری طور پر دو طبی جماعتیں مصر اور شام بھیجے گا۔

وزیر اعظم نے مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال پر بات چیت کرنے کے لیے ایران، ترکی اور سعودی عرب کا دورہ کیا۔ دوروں کے خاتمہ پر تہران اور انقرہ میں جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیوں میں ایران اور ترکی نے پاکستان سے اس

بات پر اتفاق رائے کیا کہ نومبر ۱۹۶۷ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد کے مطابق اسرائیل کو عرب علاقے خالی کرنے چاہئیں جو مشرق وسطیٰ کے تصفیہ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

سعودی عرب سے اپنی واپسی پر وزیراعظم نے ۲ر اکتوبر کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ پاکستان عربوں کو ان کی منصفانہ جدوجہد میں سیاسی امداد کے علاوہ بھی کچھ اور دے رہا ہے۔

پاکستان نے اسلامی کانفرنس کے سکریٹری جنرل تنکو عبدالرحمٰن کے اشتراکِ عمل سے ایک اسلامی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی، تاکہ تمام مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور یروشلم کو آزاد کرکے اور مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرانے میں عرب بھائیوں کی جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے وسائل کو مجتمع کیا جائے۔ اس سلسلے میں وزیراعظم نے خصوصی ایلچیوں کو اپنے پیغام دے کر کئی مسلم ممالک میں بھیجا جن میں اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے حمایت کی درخواست کی گئی خصوصی نمائندوں نے جن ممالک کا دورہ کیا انھوں نے نہ صرف مناسب جواب دیا، بلکہ انھوں نے پاکستان کی نیک خواہشات کی تعریف بھی کی۔

جناب بھٹو کی قیادت میں حکومت پاکستان نے مشرقی و جنوبی ایشیا کے علاقوں میں اپنے تعلقات اور خارجہ پالیسی میں بھی بنیادی تبدیلیاں کیں۔ پاکستان نے سیٹو سے علیحدگی اختیار کرلی۔ جمہوریہ ویت نام اور عوامی جمہوریہ کوریا کی نیشنل یونین حکومت کو تسلیم کیا۔ یہ اقدامات نہ صرف — پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اہتمام میں اس کی آزادی کی دلالت کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے پاکستان کو مشرقی یا جنوبی مشرقی ایشیا کے تمام ممالک سے دو طرفہ بنیاد پر تعلقات پیدا کرنے

اور مستحکم بنانے کے قابل بھی بنادیا۔

جاپان نے جنگی قیدیوں کے مسئلے پر پاکستان کی حمایت کی، اس لیے پاکستان نے جاپان کے ساتھ مشاورتی بات چیت کا معاہدہ کیا۔ جاپان پاکستان کو معقول اقتصادی امداد فراہم کر رہا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ ۷۳ - ۱۹۷۲ء کے دوران جاپان نے پاکستانی برآمدات کے لیے بہت بڑی منڈی مہیا کی ہے۔ جاپان کراچی کے قریب پورٹ قاسم کی تعمیر میں بھی پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔

پاکستان کے تمام یورپی ممالک سے بھی خوشگوار تعلقات ہیں۔ پاکستان کو امداد دینے والے کنسورشیم ممالک میں سے زیادہ تر مغربی یورپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی پاکستان کو اقتصادی امداد دینے والا دوسرا بڑا ملک ہے۔ پاکستان کے ساتھ اس کا طرز عمل افہام وتفہیم اور تعاون کی بنیاد پر قایم ہے۔ گو کہ پاکستان نے عوامی جمہوریہ جرمنی کو بھی تسلیم کر لیا ہے، لیکن اس سے وفاقی جرمنی کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ فرانس کے ساتھ پاکستان کے سالانہ دوطرفہ مشوروں کے انتظامات کیے ہیں۔ فرانس نے بھی پاکستانی جنگی قیدیوں کے سلسلے میں پاکستان کی بدستور حمایت کی تھی۔ وزیر اعظم نے ۱۹۷۳ء میں فرانس کا دورہ کیا تھا۔

اٹلی بھی ایڈ ٹو پاکستان کنسورشیم کا رکن ہے۔ اس ملک سے بھی پاکستان کے تعلقات شروع ہی سے دوستانہ رہے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں حکومت اٹلی نے جموں و کشمیر میں لائن آف کنٹرول کو ختم کرنے کے لیے مشترکہ بنیادیں تلاش کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے کی غرض سے اپنے سفیر لوڈلا کو برصغیر

میں بھیجا۔ ۱۹۷۳ء میں وزیر اعظم پاکستان نے اٹلی کا کامیاب دورہ بھی کیا۔

چھوٹے مغربی ممالک کے ساتھ بھی پاکستان نے اچھے تعلقات استوار کیے ہیں۔ خصوصاً تجارت کے شعبے میں پاکستان یورپی اقتصادی برادری کو انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ اور اس تنظیم سے لین دین خصوصاً لندن مارکیٹ پر انحصار ختم کرنے کی وجہ سے پاکستان اپنی تجارت کو متنوع بنا رہا ہے۔ اپنی نئی آزاد خارجہ پالیسی کی وجہ سے پاکستان نے دولت مشترکہ سے علیحدگی کا اعلان کیا، لیکن اس سے برطانیہ کے ساتھ دو طرفہ تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ برطانیہ میں مقیم پاکستانی باشندوں کی شمولیت کا سوال دوستانہ طور پر حل ہو چکا ہے۔

تمام بڑی طاقتوں سے اچھے تعلقات اور بہتر مفاہمت کے لیے پاکستان کی مسلسل کوششوں کی حالیہ مثال ستمبر ۱۹۷۳ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا دورۂ امریکہ ہے۔ وزیر اعظم بھٹو کو خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے صدر نکسن نے کہا، "پاکستان کی آزادی و سالمیت امریکہ کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے"۔ امریکہ سے واپسی پر جناب بھٹو نے ۲؍ اکتوبر کو کراچی کے ہوائی اڈے پر عوام سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے اس دورے کا مقصد امریکہ سے پاکستان کے دو طرفہ تعلقات کو مزید بہتر بنانا تھا اور یہ مقصد حاصل کر لیا گیا ہے، لیکن انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ امریکہ سے یہ گہرا تعلق پاکستان کی دوسری طاقت کے ساتھ موجودہ مفاہمت کی قیمت پر حاصل نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی حکومت کبھی ایسا اقدام نہیں کرے گی جو کسی بھی بڑی طاقت کے ذہن میں غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بنے، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان جنوب مشرقی ایشیا انڈو چائنا، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مسائل پر اپنی با اصول پالیسیوں

کو ترک کر دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ایران اور ترکی سے تعلقات بدستور ترقی پذیر رہیں گے۔

ڈاکٹر کسنگر وزیر اعظم بھٹو سے دو طرفہ تعلقات اور مشرق وسطیٰ کی صورت حال پر بات چیت کے لیے ۱۹ر نومبر کو پاکستان آئے۔ ڈاکٹر کسنگر کو دیے گئے عشائیہ میں وزیر اعظم بھٹو نے کہا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ سے کئی اعتبار سے بڑی ضروری وابستگی رکھتا ہے، اس لیے اس نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ اصولوں پر مبنی ہے۔ اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہ پاکستان مشرق وسطیٰ اور عرب ریاستوں سے بہت اچھے تعلقات رکھتا ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہم نازک تکلیف دہ اور فرسودہ طریق کار پر اپنی مقصدیت اور انصاف پسندی سے سمجھوتہ نہیں ہونے دیں گے جو کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل کے حل کی تلاش میں اختیار کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر جامع حل کے لیے امریکی کوششوں کو بہت دل چسپی سے دیکھے گا۔ پاکستان سے روانگی کے موقع پر ڈاکٹر کسنگر نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وزیر اعظم بھٹو ہماری ہی طرح تمام بنی نوع انسان کے مفاد کی خاطر مشرق وسطیٰ میں دیرپا اور منصفانہ امن کی جانب بڑی کوشش شروع کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو اوائل عمری سے اسلامی اتحاد کے عظیم تصور اور نسل انسانی کی نجات اور خوش حالی کے لیے اس کی زبردست قوتوں سے متاثر ہیں۔ ان کا ماضی، ان کا طالب علمی کا زمانہ ان کی اس سوچ کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے اسلامی اتحاد اور امن کے لیے کب سے جد و جہد شروع کی۔

انگلستان اور امریکہ میں بحیثیت نوجوان طالب علم وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ

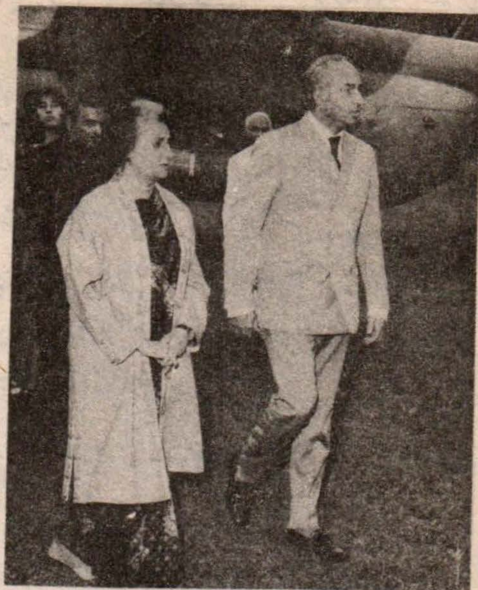
کے مستقبل سے بہت پر امید تھے۔ ان کی عوامی زندگی اسلامی اصولوں سے گہری وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ایک طالب علم، ایک سیاسی رہنما، ایک مفکر اور وزیر خارجہ اور آخر میں پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے اسلامی اتحاد کے مستحکم احساس کو نئے معنی اور نیا فکر عطا کیا۔

یونیورسٹی آف ساؤتھرن کیلیفورنیا یونیورسٹی میں جب وہ طالب علم تھے تو انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے ایک مضمون "اسلامی ورثہ" میں یوں کیا۔

"قدرت اسلامی اتحاد کی مقتضی ہے۔ سیاسی حقیقت اسے حق بجانب قرار دیتی ہے۔ آئندہ نسل اسکی منتظر ہے اور خدا کی قسم ہم اسے حاصل کرلیں گے۔ جرأت ہمارے خون میں بسی ہوئی ہے۔ ہم عظیم ورثہ کے مالک ہیں، ہم کامیاب ہوں گے۔"

پاکستان نے اسرائیل کے ساتھ جسے مئی ۱۹۴۸ء میں ریاست قرار دیا گیا کبھی مفاہمت نہیں کی اور سختی سے اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ اس نے اسرائیل کو تسلیم کرنے یا اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق قائم کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان نے فلسطین کے بارے میں ہمیشہ گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور ہمیشہ اس سلسلے میں عربوں کی قرار دادوں کی حمایت کی۔ پاکستان ہمیشہ اقوام متحدہ کی اس اکثریت کی صف اول میں رہا جس نے عرب دنیا کے قلب میں اجنبی یہودیوں کی ریاست کے قیام کی مخالفت کی۔

فلسطین کے سوال پر پاکستان کا موقف نوآبادیاتی سامراجی تسلط کے خلاف جدوجہد میں اس کی حمایت کا مثالی نمونہ ہے۔ پاکستان نے فلسطینی عربوں کی سرزمین پر اجنبی قبضے کی مخالفت جس جذبے کے ساتھ کی ہے وہ اس اسلامی



جناب بھٹو اور محترمہ اندرا گاندھی، ایک خوبصورت تصویر

روح کی مثال پیش کرتا ہے جو عدم مساوات کی دائمی مزاحمت کرتی ہے اور دنیا میں ایسا نظام قایم کرنا چاہتی ہے جو حق و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہو۔ اس طرح عالمی امور میں مسئلہ فلسطین پہلا مسئلہ تھا جس نے نئی خود مختار مملکت پاکستان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ اعلان بالفور اور لیگ آف نیشنز کی فلسطین کے متعلق یادداشت عربوں کو آزادی دینے کے برطانوی وعدوں کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ غیر علاقے میں اجنبی ریاست قایم کرنے کی تجویز اقوام متحدہ کے منشور اور عالمی توازن کے خلاف تھی اور پاکستان اس موقف پر قایم رہا۔ نئی ریاست کے سربراہ مملکت کے

اولین اقدامات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انھوں نے صدر ٹرومین کو ایک پر جوش خط لکھا جس میں انھیں فلسطینی عربوں کو اس سرزمین سے جو دو ہزار سال سے ان کا وطن ہے محروم کرنے کی خوفناک کوشش سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

"میں یقیناً اس رشتے کا ثبوت پیش کرسکتا ہوں جو عالم اسلام میں موجود ہے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس مرحلے میں اپنی برتر پوزیشن کو مجتمع کریں اور ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالیں جو پرانے رشتوں پر قائم ہو۔

بدقسمتی سے ہماری کمزوری کی وجہ سے ہمارے اقتصادی ذرائع کا غیر ملکیوں کے ہاتھوں بہت استحصال ہوا ہے۔ استحصال پسند قوتیں مغرب کے مفاد میں گردن کاٹنے کی تجارت کے ذریعے اپنی تجوریاں بھرنے میں شرمناک حد تک مصروف ہیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے اوّل تو ہمیں اپنے مسلمان بھائیوں سے وسیع پیمانے پر روابط بڑھانے ہوں گے جس کے لیے ہمیں طلبا، پروفیسروں، فنکاروں اور دیگر تمام دانشوروں کو جو دوسرے افراد کے ذہنوں کو جھنجوڑ سکیں ایک دوسرے کے علاقے میں تبادلے کرنے ہوں گے۔ یہ دانشور اہم مسائل پر تبادلۂ خیال کریں گے۔ ان کوششوں کے بعد اقتصادی تعاون کو کمزور سیاسی اتحاد میں ہی ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک فروغ دینا ہوگا۔ اگر ہم اس سمت میں دیانتداری سے کام کریں تو میرا خیال ہے کہ آئندہ بیس سال میں یہ تحریک ایک اہم شکل اختیار کرے گی۔ یہی وہ وقت ہے جب مسلمانوں کی وہ نوجوان نسل جو استحصال کا خاتمہ چاہتی ہے انصاف پر مبنی نظام اور مستقبل کی نئی طاقت کی رہنما ہوگی۔ ہم آج بھی متعدد مشترکہ خصوصیات کے حامل ہیں اور اپنی تہذیب میں ہم آہنگی کی بدولت دوبارہ سیاسی طور پر متحد ہو سکتے ہیں۔"

۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو جناب بھٹو نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا، "اس ضمن میں دیگر اہم تصفیہ طلب مسائل کے ساتھ میرے ذہن میں الجیریا کا مسئلہ بھی ہے جہاں ابھی تک محب وطن افراد کا خون آزادی کی جنگ میں بہہ رہا ہے۔ کیا یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں ہے کہ ایک ایسی قوم جو تاریخ میں مساوات اور آزادی کے لیے مشہور ہے، اس کے خلاف جدوجہد آزادی کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔

گذشتہ سال جنرل اسمبلی کے آغاز میں ہم نے جنرل ڈیگال کے ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا تھا جس میں انھوں نے الجیریا کے عوام کے لیے حق خود ارادی کو تسلیم کیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس کے بعد اب تک اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا جو اس ناقابل انتقال حق کو حقیقت میں تبدیل کر سکے۔ ایک ایسے وقت میں جب براعظم افریقہ کے کئی ممالک اس اسمبلی میں اپنی جگہ حاصل کر رہے ہیں۔ ہم بڑے افسوس کے ساتھ الجیریا کی غیر حاضری محسوس کرتے ہیں۔ ہم متعلقہ فریقوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس انسانی مسئلے کو پرامن ذرائع سے حل کرنے کے لیے ایک سعی اور کریں۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو انسانی تاریخ میں ایک المناک باب بند ہو جائے گا اور الجیریا کے بہادر عوام کو امن، آزادی اور وقار حاصل ہو گا جس کے لیے وہ طویل عرصے سے نہایت منظم جدوجہد کر رہے ہیں۔

مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کی ناکامی نے شرق اوسط کو اس پورے عرصے میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کر رکھا ہے۔ تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ شرق اوسط میں کشیدگی کے خاتمے کے لیے حقیقت پسندی سے کام لیا جائے۔ میرے وفد کی رائے میں اس معاملہ میں حقیقت پسندانہ رسائی یہ ہو سکتی ہے کہ ان دس لاکھ عرب

مہاجروں کے انسانی حقوق کو تسلیم کیا جائے جنھیں ان کے وطن سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ جب اقوام متحدہ کی اس مسئلہ کے متعلق قراردادوں پر عملدرآمد نہیں کرایا جائے گا مشرق اوسط میں باہر کی کوئی بھی طاقت پائیدار اور موثر امن قائم نہیں کر سکتی۔"

جناب بھٹو نے ۱۹۷۰ء میں ایبٹ آباد میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ فلسطین کے بارے میں فرمایا تھا، "نظریۂ پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو دنیا میں جہاں کہیں مسلمان مصیبتوں میں مبتلا ہوں ان کی خدمت کرنی چاہیے۔ اگر بھارت میں مسلمانوں کا خون سفاکانہ طور پر بہایا جائے تو ہم صرف ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر شرق اوسط میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جائیں تو آپ کو اس کے سد باب کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

۱۹۷۰ء میں چارسدہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے فرمایا، "ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ اسلام ہمارا مذہب ہے۔ ہم اسلام کی سربلندی کی خاطر نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں ہر جگہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ جب مسجد اقصیٰ کو اسرائیل نے نذر آتش کرنے کی مذموم کوشش کی تو پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن اپنا خون دینے کو تیار تھے۔"

جناب بھٹو نے ۱۹۷۰ء میں ہی مردان میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم اسلام کی سربلندی کے لیے نہ صرف پاکستان میں، بلکہ جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں خدمات انجام دیں گے۔ اگر مجھے مسلمان کی عزت کا احساس نہیں ہوتا اور اگر میں سچا مسلمان نہیں ہوتا تو میں بھارت کا پامردی سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں۔ کون کہتا ہے کہ مساوات ہمارے مذہب کے خلاف

ہے۔ مساوات ہمارے مذہب کا پیغام ہے اور اسلام پھیلا ہی اس پیغام کی بدولت ہے"۔

۲۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو خارجہ پالیسی پر ہونے والی بحث میں حصہ لیتے ہوئے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے فرمایا، " اب جناب اسپیکر میں اسلامی سربراہ کانفرس کی طرف آتا ہوں۔ میں حزب اختلاف کے ارکان اور سرکاری بنچوں پر بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا ان جذبات کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا اظہار انھوں نے اس کانفرنس کے بارے میں کیا۔ پاکستان نے مشرق وسطیٰ کے تنازعہ میں ہمیشہ عرب ممالک کی حمایت کی ہے۔ پاکستان نے اسرائیل کے ساتھ تصادم میں ہمیشہ اپنے عرب دوستوں کا ساتھ دیا ہے، لیکن میں یہ کہوں گا کہ اس جھگڑے میں ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کی توقع موجودہ حالات میں دھمکیوں کے باوجود ہم سے کی جا سکتی تھی۔ ہم نے اپنے عرب بھائیوں کے منصفانہ موقف کی جو خدمت کی ہے ہمیں اس پر فخر ہے۔ اگر ۱۹۵۶ء میں سوئز کے بحران کے موقع پر یا کسی اور مسئلے کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی تھی تو مجھے امید ہے کہ وہ غلط فہمی اس دوستی، یگانگت اور خلوص سے ختم ہو چکی ہے جس کا مظاہرہ ہم نے اس موقع پر عرب بھائیوں سے کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب دوسری کوئی جنگ نہیں ہوگی، لیکن اگر کوئی جنگ ہوئی تو ہم وہی موقف اختیار کریں گے اور ضروری ہوا تو عرب بھائیوں کے موقف کی حمایت اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر کریں گے چاہے چھوٹی یا بڑی طاقتوں کا رویہ کچھ ہی ہو۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ یہ ہمارا عہد ہے اور ہم اس کی پاسداری کریں گے، یہ پاکستان کے عوام کے جذبات ہیں۔

وہ ایک عظیم المیہ تھا جب فلسطینی عوام سے زبردست ناانصافی کی گئی۔ اس سے بڑی ناانصافی کی کوئی اور مثال نہیں مل سکتی۔ مشرق وسطیٰ میں ۱۹۴۸ء میں جو کچھ ہوا اس سے

بڑھکر اور کیا ظلم ہوسکتا ہے۔ یہ ایسی ناانصافی تھی جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ عظیم لوگوں کے خلاف ایک سنگدلانہ فعل تھا۔ عرب عوام کئی نشیب و فراز سے گزرے ہیں، لیکن ۱۹۷۲ء کے عرب وہ عرب نہیں جو ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں تھے۔ نہ وہ ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء والے عرب ہیں۔ عرب قوم اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اب انصاف کی قوتوں کی پیش قدمی جاری ہے اب یہ بات بالکل عیاں ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان عوام کے ساتھ انصاف کو نہیں روک سکتی۔ وہ ۲۵ سال سے زائد عرصے تک مصائب کا شکار رہے ہیں۔ انھوں نے چار جنگیں دیکھی ہیں۔ انھیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے، لیکن آج وہ ایک بیدار قوم ہیں۔ آج انھوں نے دنیا پر واضح کردیا ہے کہ وہ ایک عظیم اور گراں قدر تہذیب کے مالک ہیں۔ انھوں نے ایک دن میں دنیا میں طاقت کا توازن بدل کر رکھ دیا ہے۔ آج وہ مغربی دنیا، جو مشرقی دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی وہ مشرقی دنیا یعنی عرب قوموں کے وسائل کی محتاج ہے۔ وہ کون ہیں جو وسائل کے مالک رہے ہیں اور وہ کون ہیں جو وسائل سے محروم ہیں۔ صدیوں تک بے سروسامان رہے ہیں۔ آج عربوں نے یہ واضح کردیا ہے کہ مغرب اپنے تمام تر وسائل کے باوجود ایک ضروری وسیلے کے سلسلے میں محروم ہے ہم عربوں کی کوششوں کو سلام کرتے ہیں اور ہم ان کے ساتھ ہیں۔ ہم جنگ کی صورت میں اور امن کی حالت میں ان کے شانہ بشانہ ہیں۔ یہ اسلامی سربراہ کانفرنس عرب عوام کے جائز اور منصفانہ موقف کے لیے اسلامی اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے پاکستان میں منعقد ہورہی ہے۔

ہم اس کانفرنس میں میزبان بننے پر فخر کریں گے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تمام اسلامی ممالک اس کانفرنس میں شرکت پر رضامند ہو چکے ہیں۔ چونکہ یہ ۳۰ یا اس سے بھی زائد ملکوں کی کانفرنس ہے اور ہمیں باہمی طور پر متفقہ تاریخیں مقرر کرنے

کے سلسلے میں ہر ایک ملک سے مشورہ کرنا تھا، لہٰذا تاریخیں مقرر کرنے کا فیصلہ قدرے مشکل تھا۔ ایک مرحلہ پر ہمارا خیال تھا کہ یہ کانفرنس ۱۵ جنوری کو منعقد ہوگی لیکن دو تین سربراہان مملکت کی مصروفیات پیش نظر سب نے درخواست کی کہ کانفرنس فروری تک ملتوی کر دی جائے۔ ان سب نے بلا استثنا فروری میں کانفرنس میں شرکت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

مجھے آج پاکستان کی قومی اسمبلی کو کانفرنس کی تاریخوں کے بارے میں آگاہ کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ متفقہ تاریخیں ہیں جن پر تمام مسلم ممالک نے رضامندی ظاہر کی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کانفرنس لاہور میں ہوگی۔ سب سے پہلے ۱۶ اور ۲۰ فروری کو وزرائے خارجہ کا اجلاس ہوگا۔ ۲۱ فروری کو کوئی اجلاس نہیں ہوگا کیوں کہ اس دن سربراہان مملکت اور حکومت کے سربراہوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ وزرائے خارجہ ان کے استقبال کے لیے جائیں گے۔

بلاشبہ ہم بھی ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے، لہٰذا ۲۱ فروری کو کوئی اجلاس نہیں ہوگا۔ حکومتوں اور مملکتوں کے سربراہوں کی کانفرنس ۲۲ فروری کو شروع ہوگی جو دو دن تک جاری رہے گی اور اگر ضروری ہوا تو یہ تین دن تک جاری رہے گی۔ لاہور ایک خوبصورت شہر ہے اور اس کے شہری زندہ دل اور خوش اخلاق ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مسلم سربراہوں کا اپنے دوستوں اور بھائیوں کا شاندار استقبال کریں گے۔ ہم اپنی مہمان نوازی کی روایات کے مطابق ہر ممکن کوشش کریں گے اور اپنے قابلِ احترام مہمانوں کا پاکستان میں قیام خوشگوار اور آرام دہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔ یہ کانفرنس عالمی اہمیت کی حامل ہوگی۔ ہم سب کو امید ہے اور ہماری دعا ہے کہ اس کانفرنس سے اسلامی

اتحاد اور اسلامی یگانگت کے فروغ میں مدد ملے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرق وسطیٰ کے تنازعے کے باعزت حل کے لیے یہ مددگار ثابت ہو گی۔ یہی کانفرنس کا مقصد ہے اور اس مقصد کے فروغ کے لیے یہ عرب سربراہ کانفرنس سے ایک قدم آگے ہو گی۔"

چنانچہ ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کو پاکستان کے عظیم شہر لاہور میں یہ عظیم اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ پاکستان کو اپنی تاریخ میں اتنا بڑا اعزاز کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ یہ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اسلامی سکریٹریٹ نے اس اہم نازک اور تاریخی موقع پر اس اعلیٰ ترین سطح کی کانفرنس کے انعقاد کے لیے پاکستان کی سرزمین کا انتخاب کیا۔ یقیناً اس کے لیے ہمارے قابل قدر وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اس کانفرنس کے لیے میزبان بننے کی ذمہ داری قبول کی۔

پاکستان کا منتہائے نظر مسلم ممالک کے درمیان اسلامی وحدت کا فروغ رہا ہے۔ اور یہی ہمیشہ اس کی خارجہ پالیسی کا نصب العین رہا، مگر نئے آئین کے تحت یہ بات اب پاکستان کی آئینی ذمہ داری میں شامل ہو چکی ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عربوں پر اسرائیل نے پھر حملہ کیا تھا، لیکن اس مرتبہ عربوں نے نہایت بہادری کے ساتھ اسرائیل کی فوجی طاقت کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ عربوں نے اپنا منصفانہ موقف منوانے کے لیے اسرائیل نواز ملکوں کے خلاف تیل کا اقتصادی حربہ استعمال کیا اور اس کے مثبت نتائج نکلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں اپنے تحفظ، ترقی اور خوش حالی کے لیے اتحاد کا زبردست جذبہ بیدار ہوا جس کے نتیجے میں یہ اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کی گئی۔ مسلم نشاۃ ثانیہ کا جذبہ نیا نہیں تھا، مگر اسے عملی شکل دینے میں خاصی دشواریاں درپیش تھیں، تاہم ۱۹۶۹ء میں رباط کانفرنس کے انعقاد سے اس کی راہ ہموار ہونی شروع ہو چکی تھی اور اب مسلم ممالک کے

اتحاد کو ٹھوس شکل دینے کی غرض سے ان اصولوں کی نشان دہی ضروری تھی جن کی بنیاد پر پائیدار اتحاد استوار کیا جا سکتا تھا خدا کا شکر ہے کہ اعلان لاہور کے ذریعے مسلم سربراہوں نے ان بنیادی اصولوں کا اظہار کر دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ اسلامی ممالک ترقی اور خوشحالی کے لیے یک جہتی اور اتحاد کے ساتھ کام بھی کر سکتے ہیں اور اپنے علاقے اغیار سے واپس بھی لے سکتے ہیں۔

اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی یہ دوسری کانفرنس دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کا سب سے بڑا اور نمائندہ اجتماع تھا۔ اس اجتماع کی مذہبی حیثیت کے علاوہ یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس میں دنیا کی آبادی کے کم از کم پانچویں حصے کی نمائندگی ہوئی، چنانچہ اگر اب بیت المقدس کی آزادی کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عوامی جمہوریہ چین جیسے انصاف پسند ممالک کے مطالبات پر حالیہ سربراہ کانفرنس کی قرارداد کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ اب پوری دنیا ایک طرف ہے اور اسرائیل اور اس کے حواری دوسری طرف۔ اس کانفرنس نے بیت المقدس کی آزادی سے متعلق جو قرارداد منظور کی ہے وہ عالمی امن کی بنیادی ضرورتوں کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ قرارداد میں بیت المقدس کے ذرے ذرے سے مسلمانوں کی گہری عقیدت اور وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے عزم کیا گیا ہے کہ پیغمبروں کی اس مقدس سرزمین کی بازیابی کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے گی اور اسے سودے بازی کا حصہ ہرگز نہیں بننے دیا جائیگا۔ سینتیس ۳۷ سے زائد اسلامی ملکوں کی متفقہ رائے کے مطابق مشرق وسطیٰ میں قیام امن کی ایک انتہائی اہم اور ناقابل تبدیلی شرط یہ ہے کہ یروشلم پر عربوں کی مکمل خود مختاری بحال کی جائے۔

اس مبارک موقع پر تقریباً سب ہی مسلم ممالک کے نمائندوں نے پاکستان سے

س خواہش کا اظہار کیا کہ بنگلہ دیش کو بھی اس میں مدعو کیا جائے، کیونکہ اس کانفرنس کا مقصد ہی دنیا کے تمام مسلمانوں کو درپیش مسائل کا صحیح حل تلاش کرنا تھا اور جس کے لیے مسلم ممالک کے سربراہوں نے عالمِ اسلام کو درپیش مسائل کا احساس کیا، تاکہ ان کے حل کے لیے متحدہ کوششیں کی جا سکیں۔ یہی وہ موقعہ تھا جب تمام مسلم ممالک نے پاکستان اور بنگلہ دیش پر زور دیا کہ اپنے اختلافات کو دفن کردیں اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر برادر ملکوں کی طرح آپس میں مصالحت کرلیں۔ اس سلسلے میں ہمارے عرب بھائیوں کی مساعی شاندار طریقے پر کامیاب ہوئیں۔ پاکستان کے لیے یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ وہ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کے لیے عالمِ اسلام کے سرکردہ لیڈروں کی خواہشات اور کوششوں کا احترام نہ کرے۔

وزیرِ اعظم بھٹو اس سلسلے میں قومی اسمبلی کی منظوری کافی پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ قومی اسمبلی نے انھیں یہ اختیار دیا تھا کہ جس وقت وہ قومی مفاد میں ضروری سمجھیں، کوئی بھی فیصلہ کرسکتے ہیں۔ یہ بات ان کی صواب دید پر چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر پاکستان کے بنیادی نظریے اور ملکی وقار کی روشنی میں غور کریں اور بھارت میں مقیم اسیرانِ جنگ کے تحفظ کے امور کو پیشِ نظر رکھیں۔

جناب بھٹو پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کے لیے انتہائی پریشان رہے ہیں، چنانچہ انھیں بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ پوری مفاہمت و مصالحت کے لیے بڑا سوچ بچار کرنا پڑا۔ یہ معاملہ درحقیقت بڑا نازک اور ٹیڑھا تھا اور وزیرِ اعظم کے لیے بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان خلیجوں کو پاٹنے کا کام آسان نہیں تھا کیونکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بڑی تلخیوں کے بعد اور برہا برس کی ناکامیوں

کے بعد عمل میں آئی ۔ ان حالات میں فریقین میں سے کسی ایک کے لیے بھی ماضی کے تلخ حقائق اور زخموں کو فراموش کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود پاکستان نے جو بجا طور پر خود کو اسلامی برادری کا علمبردار اور اسلامی اتحاد کا داعی سمجھتا ہے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے اور اسلامی سربراہ کانفرنس کے نمائندوں کا احترام کرتے ہوئے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا اور اس طرح ہمارے جنگی قیدیوں کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

پاکستان کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ وہ مسلم بنگال کے ساتھ برادرانہ تعلقات از سر نو قایم کرے اور اس کے ساتھ برابری اور اخوت اسلامی کی بنیادوں پر معاشی و تجارتی روابط استوار کرے۔

وزیر اعظم کے اس بروقت فیصلے سے بین الاقوامی افق پر پاکستان کے وقار میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔

اسی اسلامی سربراہ کانفرنس کے موقع پر عالم اسلام کی طرف سے بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی شرکت پر بھی زور دیا گیا تھا، لہٰذا وزیر اعظم جناب بھٹو نے اس تاریخی کانفرنس کے موقع پر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا اور بنگلہ دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمان بارہ رکنی وفد لے کر اس اسلامی سربراہ کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے جہاں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا اس کانفرنس میں شرکت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے بھی یہ حقیقت تسلیم کر لی ہے کہ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو عالم اسلام سے دور نہیں رکھا جا سکتا اور اس طرح اسلامی سربراہ کانفرنس میں بنگلہ دیش کے وفد کی شرکت نے جہاں عالم اسلام سے اس کے سات کروڑ عوام کو نزدیک تر کر دیا وہیں پاکستان اور بنگلہ دیش کے سیاسی، اسلامی اور ثقافتی تعلقات کی استواری کی طرف پہلا دوستانہ قدم بڑھایا۔

جناب بھٹو نے کہا تھا "بنگلہ دیش ایک حقیقت ہے اور یقیناً ایک حقیقت ہے۔ اگر یہ حقیقت نہیں تو پاکستان کے تسلیم کر لینے کے بعد بھی حقیقت نہیں بنے گی، لیکن پاکستان اور بنگلہ دیش کے عوام کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی صرف یہی صورت ہے کہ پاکستان اس حقیقت کو تسلیم کرے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو برصغیر کے مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی چاہتے ہیں اور ان کی مساعی یہی ہیں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں میں اسلامی اخوت اور یکجہتی بڑھے اور ماضی کی تلخیوں کا ازالہ ہو جائے۔

"اسلامی اتحاد ہمارا مقدر اور سیاسی حقیقت ہے۔" اس نظریے کے تحت جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ترتیب دیا۔ اس پالیسی نے الجزائر سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے تقریباً ۸۰ کروڑ مسلمانوں میں جن کی ۵۰ خود مختار ریاستیں ہیں اور وہ ممالک قدرتی اور معدنی وسائل سے مالا مال ہیں قومی اور ملی مقاصد کو واضح کر دیا اور اب وہ تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی، تجارت اور صنعت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے۔ اس طرح تیسری دنیا دنیا کے نقشے پر بہت جلد اور واضح طور پر ابھر کر منظر عام پر آئے گی۔

سربراہ کانفرنس جو پاکستان کی خارجہ پالیسی کے تحت ظہور پذیر ہوئی اس نے دنیا کو چونکا دیا اور دنیا بھر کے اخبارات اور دانشوروں نے اسے پاکستان کی سفارتی فتح قرار دیا۔

روزنامہ گارڈین لندن نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا، "سفارتی جنگ میں مسٹر بھٹو فاتح ہیں اور شیخ مجیب اور مسز اندرا گاندھی جو اب داخلی بے اطمینانی کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی ہیں شکست خوردہ ہیں۔ مسٹر بھٹو نے بنگلہ دیش تسلیم کر کے بہت کچھ



بنگلہ دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن اور جناب بھٹو ـــ ایک یادگار تصویر

پایا ہے اور کچھ بھی نہیں کھویا۔ انھوں نے ایک نڈھال، ٹوٹے پھوٹے اور شکست خوردہ ملک کی باگ ڈور سنبھالی جو اپنے بڑے پڑوسی کی فوجوں کے زیر تسلط اور اپنے نصف وسائل سے محروم ہونے کی وجہ سے اقتصادی ابتری کا شکار تھا۔"

روزنامہ ازویستیا، ماسکو نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا، "پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا اسلامی سربراہ کانفرنس کا مثبت نتیجہ ہے۔ اس کانفرنس سے مسلم ممالک کی امن و ترقی اور نو آبادیاتی اور سامراجی نظام کے خلاف

کام کرنے والی طاقتوں کو تقویت ملی ہے اور اس کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔"

چیکوسلواکیہ کے روزنامہ "رودپراوہ" نے وزیر اعظم بھٹو کو یوں سراہا۔ "وزیر اعظم بھٹو کے تدبر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، کیوں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا فیصلہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس سے بر اعظم جنوب ایشیا میں ترقی کی کئی راہیں کھلیں گی اور ۱۹۷۱ء کے ناخوشگوار واقعات کا نہ صرف ازالہ ہوگا، بلکہ صورت حال یقینی طور پر معمول پر آجائے گی۔"

ایران کے تمام فارسی اور انگریزی اخبارات میں مشترکہ پریس ریلیز میں کہا گیا، "وزیر اعظم بھٹو نے بنگلہ دیش کی طرف دوستی کا جو ہاتھ بڑھایا ہے بنگلہ دیش کو بھی چاہیے کہ وہ ۱۹۵ جنگی قیدیوں کو رہا کر کے یہ ثابت کرے کہ وہ بھی پاکستان سے دوستی کا خواہاں ہے۔ اس کانفرنس نے انتہائی تعمیری کارنامہ انجام دیا۔"

تنظیم آزادیٔ فلسطین کے سربراہ جناب یاسر عرفات نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا، "اسلامی سربراہ کانفرنس کی بدولت فلسطین کے محاذ پر آزادی کی شاہراہ ترتیب ہو گئی ہے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں مسئلہ فلسطین کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہم تہہ دل سے اس کے شکر گزار ہیں پاکستان کی نئی نسل امید کی نسل ہے۔"

دار الفکر الاسلامی کے مدیر جناب حکیم محمد سعید نے اسلامی سربراہ کانفرنس کے مقدس موقع پر سربراہ کانفرنس کو احساسِ ملی اور اتحادِ مسلم کے دیرینہ خواب کی تعبیر سے تشبیہ دیتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار یوں کیا، "لائقِ تہنیت ہیں ہمارے فعال اور ذی ہوش وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو جنھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت

اور اثر و رسوخ سے کام لیکر اس عظیم اجتماع اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ پاکستان میں اجتماع محمدی کا یہ اجتماع اللہ تعالیٰ کے بندوں کی یہ مجلس انشاءاللہ العزیز نتیجہ خیز ہوگی اور پُر مقصد۔"

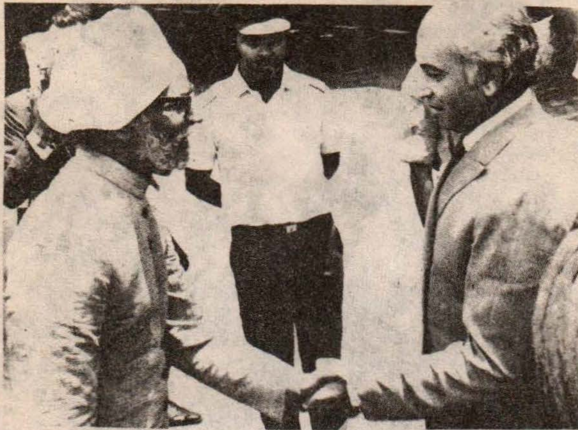
عراقی بعث پارٹی کے ترجمان جناب قاسم سلام نے فرمایا، " پاکستان اور عراق کے تعلقات بہت اچھے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وزیر اعظم بھٹو ایک ترقی پسند تحریک کی قیادت کر رہے ہیں۔"

بنگلہ دیش کے وزیر اعظم جناب شیخ مجیب الرحمان نے اس کانفرنس سے متاثر ہو کر فرمایا، " میں مسٹر بھٹو کے خلوص سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ پاکستان کے لوگوں نے جس محبت کا اظہار کیا اس نے میرے دل پہ گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ہمیں نئے سرے سے ابتدا کرنی ہوگی۔"

پاکستان کے پرانے سیاست داں جناب ولی خاں (نیپ) نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا، " بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فیصلے سے برصغیر کے حالات کو معمول پہ لانے میں مدد ملے گی۔ حقیقتوں کو تسلیم کرنے کی جانب یہ ایک اہم قدم ہے۔ یہ شملہ سمجھوتے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں طے پایا گیا تھا کہ باہمی مفاہمت کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔"

پاکستان کی خارجہ پالیسی ریاست کی حاکمیت، خود مختار ریاستوں کی برابری، حق ہمسائیگی پر مبنی اچھے تعلقات، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت اور دوسروں پر اپنے نقطۂ نظر یا نظریہ ٹھونسنے سے اجتناب کے اصولوں کی تائید و حمایت کرتی ہے۔ امن اور دوطرفہ خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے۔

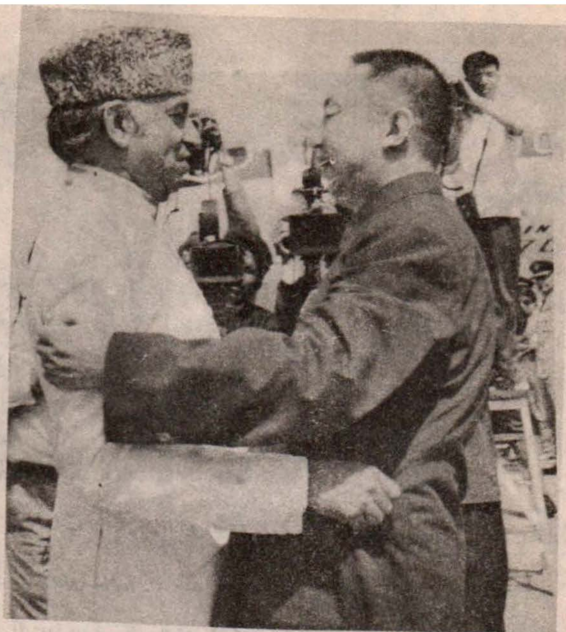
پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جو بیک وقت چین، امریکہ اور روس سے اچھے



اور پرجوش تعلقات رکھتا ہے، اس لیے وہ ہر ایسے اقدام سے جس سے کسی بھی بڑی طاقت کے ساتھ اچھے تعلقات متاثر ہو سکتے ہوں، گریز کرتا ہے۔

پاکستان ہمیشہ سے تمام اقسام کے نوآبادیاتی نظاموں، نسلی امتیاز اور جارحیت کا مخالف رہا ہے، اس لیے اس نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے موقف اور ترقی پسند سماجی تحریکوں کی بدستور حمایت کی ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء کو جناب بھٹو نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں چلی میں فوجی بغاوت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

امن و انصاف کے اصول جن کی پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی میں ہمیشہ تائید کی، تیسری دنیا کی امنگوں کے عین مطابق ہیں، اس لیے اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان حالات کے ساتھ پاکستان کے تعلقات مستقل طور پر فروغ حاصل کرتے رہیں گے۔ پاکستان، عرب دنیا، ایشیا اور افریقہ سے تعلقات مستحکم بنانے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے۔ پاکستان کی نئی خارجہ پالیسی کے نتیجے میں یہ تعلقات مزید مضبوط ہوں گے۔



جناب بھٹو چین کے وزیر خارجہ کے ساتھ

ملک کے اندر حالات کی تیزی سے بحالی، استحکام کی فضا اور عوام کی حکومت کے اقدامات کے نتیجے میں ہونے والے سماجی و اقتصادی ترقی بلاشبہ غیر ملکی امداد کے دوبارہ آغاز اور پاکستان کی برآمدی تجارت میں توسیع کے سلسلے میں قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ایک نیا پاکستان وجود میں آچکا ہے جو اپنی ہیئت اور مقاصد و بنیادی خصوصیات کی وجہ سے ہماری نئی سیاسی بصیرت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہماری خارجہ پالیسی اس امر کا ثبوت ہے جو موجودہ بین الاقوامی صورت حال کو اور پاکستان کی جغرافیائی و سیاسی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کی ضمانت ہے کہ پاکستان عالمی امور میں تعمیری و بامقصد کردار ادا کرتا رہے گا۔

نیا سویرا

جناب ذو الفقار علی بھٹو نے عوام کے انقلابی مزاج اور قومی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عوامی تحریک کی قیادت سنبھالی لیکن یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ آج بھی کچھ خود غرض سیاستداں اپنی اجارہ داری قایم رکھنے کے لیے ایسے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں جن سے وقتی طور پر حکومت کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ستاروں کی روشنی بجھ چکی ہے۔ جانور ہمیں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ ہم وقت کے شہپر پر تنہا کھڑے ہیں۔ ایسے عالم میں ہم آہ تو کر سکتے ہیں، لیکن کسی کی مدد کا انتظار نہیں ـــــ

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہی یعنی ۱۹۵۸ء کے بعد ہمارا ملک ایک مضبوط اور مستحکم قیادت سے محروم ہوگیا اور شخصی اور فوجی حکومت کا ایک طویل دور ہم پر مسلط رہا۔ ملک افسر شاہی اور اندرونی و بیرونی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ نتیجۃً ملک کی سالمیت اور استحکام کو جو نقصان پہنچا وہ ناقابلِ تلافی تھا۔

اس مکدّر فضا میں جن غریب، بھولے بھالے غریب عوام نے قیام پاکستان کے لیے جانی و مالی قربانیاں دی تھیں اور معاشی و سیاسی خود مختاری اور ایک روشن صبح کے خواب دیکھے تھے۔ انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ ہمارے ملک میں نہایت شرمناک اور ذلت آمیز ڈرامے کھیلے گئے اور ان ڈراموں میں استحصالی نظام کے دلالوں، نوکر شاہی اور اجارہ پرست سیاست دانوں نے بھولے بھالے معصوم عوام کے جذبات سے خوب کھیلا اور انھیں سبز باغ دکھائے اور اپنے اقتدار کو اور مستحکم کیا اور اس طرح ہمارے ملک کی بنیادیں اور بھی کھوکھلی ہوگئیں۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کے انقلابی مزاج اور قومی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عوامی تحریک کی قیادت سنبھالی اور ملک کے مزدور، ہاری، طالب علم، دانشور، غریب، کلرک، چپراسی، سبزی فروش، رکشا ٹیکسی والے غرض استحصال کا ستایا ہوا ہر شخص آمریت کے خاتمے اور عوامی جمہوریت کے قیام اور سوشلزم کی انقلابی جدوجہد کی تحریک میں شامل ہوگیا۔

جناب بھٹو اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاست اور بین الاقوامی امور میں دل چسپی لے رہے ہیں۔ ان کے والد ماجد جناب شاہنواز بھٹو برصغیر جنوب ایشیا کے ایک سرکردہ لیڈر رہے تھے اور انھوں نے سندھ کو بمبئی سے پریذیڈنسی سے علیحدہ کرانے کی جد و جہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سندھ کی پریذیڈنسی سے علیحدگی کا واقعہ آخر کار پاکستان کے قیام میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔

قائد اعظم محمد علی جناح بھٹو خاندان کے دیرینہ دوست تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کی پسندیدہ شخصیت اور آئیڈیل ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے طالب علمی کے دوران بمبئی ہی میں عملی سیاست کا آغاز کیا۔ بمبئی میں ہائی اسکول تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد جناب بھٹو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے، جہاں انھوں نے ۱۹۴۷ء میں لاس اینجلز میں یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں جناب بھٹو نے برکلے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں داخلہ لیا۔ ایک باعمل اور سرگرم طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے بین الاقوامی مسائل پر بحث کے لیے کالج کی مختلف انجمنوں کو اپنایا۔ ان کی اوائل زمانہ کی تقریر جو انھوں نے اپریل ۱۹۴۸ء کو لاس اینجلز میں "ورثۂ اسلام" کے عنوان پر کی فرمایا تھا، جس سے ان کی اسلام سے گہری عقیدت اور سچے خلوص کی کسک کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے:

"میں آپ کو اسلام کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اسلام جو دورِ ماضی کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایک روشنی تھی اور جو آج بھی اندھیروں کو چمکانے والا ایک نور ہے اور جو آنے والے کل کے لیے بھی ایک روشنی ہے۔ اسی بنیاد پر میں اسلام کے مستقبل کا تصور کر سکتا ہوں۔"

برکلے جہاں سے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۵۰ء میں پولیٹیکل سائنس میں بی اے

آنرز کیا اور مشہور قانون داں پروفیسر لاسن کیلسن سے قانون پڑھا اور اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ چرچ کالج سے انھوں نے ۱۹۵۲ء میں ایم اے جورس پروڈنس میں ایم۔اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے صرف ایک سال بعد انھیں لنکن ان بار میں دعوت دی گئی اور یونیورسٹی آف ساؤتھمپٹن میں انھیں بین الاقوامی قانون کا لیکچرر مقرر کیا گیا۔ مگر وطن کی محبت اور پاکستان کے لیے کام کرنے کی لگن نے انھیں وہاں زیادہ دن نہ ٹکنے دیا۔ اور ۱۹۵۴ء میں وہ پاکستان واپس چلے آئے اور سندھ مسلم لا کالج کراچی میں قانون دستور یہ پڑھانے لگے۔

۱۹۵۴ تا ۱۹۵۸ء وہ کراچی میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ میں بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتے رہے اور اس میدان میں انھوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔

۱۹۵۸ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو ایوب خاں نے وزیر مقرر کیا۔ ۱۹۶۲ء میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت لاڑکانہ سے قومی اسمبلی کا انتخاب جیتا اور اس کے بعد وہ مرکزی حکومت میں وزارتوں پر ۱۹۶۶ء تک فائز رہے اور ۱۹۶۶ء ہی میں انھوں نے ایوب خاں کی استحصالی پالیسی کے باعث وزیر خارجہ کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ اس طرح وہ تقریباً آٹھ سال تک تجارت، ایندھن، بجلی، قدرتی وسائل، امور کشمیر، قومی تعمیر نو، اطلاعات، سیاحت، اقلیتی امور کی وزارتوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک وہ پاکستان میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے ملک کی خدمت انجام دیتے رہے۔

بجلی اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے ۱۹۶۰ء میں جناب بھٹو کی سرکردگی میں پاکستان کا ایک وفد ماسکو گیا تھا جہاں انھوں نے سوویت یونین کے ساتھ تیل کے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ اقتصادی تعاون کے میدان میں روس

۶۳ - ۱۹۶۲ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جموں و کشمیر کے تنازعہ پر بھارت کے ساتھ گفت و شنید کے چھ دور مکمل کیے۔ ۱۹۵۹ تا ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جناب بھٹو پاکستانی وفد کے چیئرمین رہے اور ۱۹۶۳ء میں وزیر خارجہ مقرر ہونے کے بعد ایک بار پھر انھوں نے جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور اس کے بعد ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں بھی انھوں نے پاکستانی وفود کی قیادت کی اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں نہایت پرجوش تقاریر کیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے وزیر خارجہ کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران پاکستان کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان میں عوامی جمہوریہ چین اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۳ء میں سرحدوں کے تعین کے ایک معاہدہ پر دستخط، برما کے ساتھ سرحدوں کے تعین کے معاہدہ کی تکمیل۔ اپریل ۱۹۶۴ء کو جکارتہ میں منعقدہ دوسری افرو ایشیائی کانفرنس کے لیے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں پاکستان کی قیادت اور اس کے صرف دو ماہ بعد انھوں نے استنبول میں آر سی ڈی (علاقائی تعاون برائے ترقی) ایران، ترکی اور پاکستان کے درمیان ایک معاہدہ پر دستخطوں کے سلسلے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء جولائی میں انھوں نے الجزائر میں منعقدہ افرو ایشیائی وزرائے خارجہ کانفرنس میں حصہ لیا اور اس کے بعد قاہرہ میں منعقدہ پاکستان، متحدہ عرب جمہوریہ، انڈونیشیا اور عوامی جمہوریہ چین کے سربراہوں کی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۶۶ء میں تاشقند کانفرنس کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو نے شدت سے محسوس کیا کہ پاکستان کے عوام مسلسل محرومیوں، مایوسیوں، ذلتوں، تلخیوں، بھوک و افلاس، بے روزگاری اور بدحالی کا شکار ہیں تو انھوں نے

استحصال زدہ لوگوں کو متحد کیا اور دوسری فوجی آمریت کے خلاف آوازہ بلند کیا اور ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کو تشکیل دیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی عوامی تحریک اور آمریت کے خلاف جناب ذوالفقار علی بھٹو کی جدوجہد میں جہاں لاکھوں، کروڑوں عوام شامل ہیں وہاں ان میں سے ایک گمنام شخص "عمر اوبھٹو" بھی تھا جس نے یحییٰ خاں کے مارشل لا میں پیپلز پارٹی کے لیے کام کرنے اور آمریت کے خلاف بغاوت کرنے کی پاداش میں فوجی عدالت سے دس کوڑوں کی سزا پائی۔

تحریک سے محبت اور چیرمین بھٹو سے عشق کرنے والے عمر او بھٹو نے بھی اپنے عشق و عقیدت کی ایسی مثال قایم کی جو کسی سیاسی جماعت کے کارکنوں کے لیے مشعلِ راہ اور لافانی رہے گی۔

فوجی عدالت سے سزا کے بعد جب عمر او بھٹو پر پہلا کوڑا برسا تو اس نے "جیئے بھٹو سدا جیئے" کا نعرہ بلند کیا۔ دوسرا کوڑا برسا تو اس نے پھر یہی نعرہ بلند کیا، یہاں تک کہ کوڑوں کی تعداد اور شدت جوں جوں بڑھتی گئی عمر او بھٹو اتنی ہی شدت سے نعرے لگاتا رہا "جیئے بھٹو، سدا جیئے"۔

اس طرح عمر او بھٹو نے دس کوڑے مردانہ وار کھائے اور سچے عاشق کی طرح جیئے بھٹو کا نعرہ لگاتا رہا جو فوجی عدالت کے آمرانہ احکام کے منہ پر تازیانہ تھا۔ جس لیڈر کے لیے عوام اپنے دلوں میں یہ جذبۂ عقیدت رکھتے ہوں وہ یقیناً امر ہے۔

جن دنوں پیپلز پارٹی کو تشکیل دیا گیا تھا ان دنوں بھی ایسے ہی کئی جذباتی واقعات رونما ہوئے۔ ایک بار چند کارکن پارٹی کے جلسے کے لیے گوجرانوالہ میں

چندہ جمع کر رہے تھے۔ اچانک ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص آیا اور قریب آکر اس نے پانچ روپے کا مڑا ہوا میلا سا نوٹ نکال کر چندہ دینا چاہا۔ کسی کارکن نے اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا، "بابا! تم یہ روپے اپنے بیوی بچوں کے لیے رکھو۔ یوں سمجھو کہ تمھارا چندہ جمع ہو گیا۔ اس بوڑھے غریب آدمی نے جذباتی ہو کر جواب دیا، "خدا کے لیے میرا یہ چندہ قبول کر لو۔ پانچ روپے ہی کیا میں تو بھٹو کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں"

یہ اس دور کی بات ہے جب ذوالفقار علی بھٹو آمریت اور فرسودہ نظام کے خلاف لڑ رہے تھے اور دائیں بازو کی جماعتوں اور ملک کے وسائل اور حکومت پر قابض استحصالی طبقے کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اس قدر مقبولیت اور وسعت پکڑ چکی ہے کہ اس کے برسر اقتدار آنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ مردہ جسموں میں حرارت کے آثار دن بدن بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ان ہی دنوں ایک اور جذباتی واقعہ رونما ہوا۔

چیرمین بھٹو ان دنوں بدین کے علاقے میں الیکشن کے دورے پر تھے۔ وہ جہاں جاتے ایک خلقت اُمڈ آتی۔ "لوگ ساتھ جیئں گے ساتھ مریں گے، آمریت کو ختم کر کے جمہوریت لائیں گے" کا عہد کرتے ہوئے عوام ہر جگہ چیرمین بھٹو کا استقبال کر رہے تھے۔ اسی علاقے میں مسٹر بھٹو کا مقابلہ کونسل لیگ کے ایک امیدوار سے تھا۔ جسے تمام مخالف سیاسی جماعتیں سپورٹ کر رہی تھیں۔ چیرمین بھٹو کا جلوس بدین سے نکل کر نہر کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ نہر کے دونوں طرف کناروں پر بوڑھے، جوان اور بچے ہاتھوں میں پیپلز پارٹی کے جھنڈے لیے چیرمین بھٹو کی کامیابی اور درازئ عمر کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ ایک درخت

کی چوٹی پہ کونسل لیگ کا جھنڈا لہراتا ہوا نظر آیا۔ ابھی چیرمین بھٹو کی کار اس درخت کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ایک سات سالہ بچی جس نے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے اس درخت کی چوٹی پر چڑھ گئی اور لوگوں نے دیکھا کہ اس نے آناً فاناً وہ جھنڈا اتارا اور اس کی جگہ پیپلز پارٹی کا جھنڈا لگا دیا اور کونسل لیگ کے جھنڈے کو لپیٹ کر جیسے ہی چیرمین بھٹو کی کار درخت کے نیچے پہنچی اس نے اپنی پوری قوت سے "جیئے بھٹو" کا نعرہ لگایا۔ یہ جذباتی منظر دیکھ کر چیرمین بھٹو کی آنکھوں میں محبت اور خوشی کے آنسو امنڈ آئے۔ یہ ایک بچی کی عقیدت تھی۔ یہ پاکستان کے تمام غریب اور مزدور محنت کش عوام کی محبت کی شدت تھی اور جب جناب بھٹو برسرِ اقتدار آ گئے اور پہلی بار بدین تشریف لے گئے تو وہ اس بچی کو تلاش کرتے ہوئے اس کے گاؤں پہنچے اور اس بچی کو پیار کیا اور بہت سارے تحفے دیئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کا ایک انفرادی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عام انسانوں کی طرح دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں، ان کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ انھیں پاکستان کے عوام سے بالکل اپنے بچوں جیسی محبت ہے۔

ایک بار قائدِ عوام ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے میانوالی جا رہے تھے۔ دو کاریں تھیں۔ ایک کار اتفاق سے راستے میں پنکچر ہو گئی۔ چیرمین بھٹو مسکرائے اور کہنے لگے، "چلو ایک ہی کار میں چلتے ہیں۔ کچھ لوگ واپس چلے گئے۔ پھر بھی چھ آدمی اس چھوٹی سی کار میں بیٹھ گئے۔ سامان زیادہ تھا۔ سب تنگ ہو رہے تھے، لیکن چیرمین بھٹو برابر مسکرائے جا رہے تھے۔ بھوک لگی تو معلوم ہوا کہ صرف ایک ٹفن ہے جس میں صرف ایک آدمی کا کھانا ہے۔ سب ہی نے چیرمین بھٹو پر زور دیا کہ یہ کھانا آپ کھائیں، لیکن وہ نہیں مانے۔ کہنے لگے، "ہم سب کھائیں گے۔" ایک پل کے قریب کار روکی گئی اور سب نے اس کھانے کو چکھا اور

پھر پانی کی تلاش کی۔ نہر کا پانی بہت خراب اور گندہ تھا۔ قریب ہی ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک مزدور رہتا تھا۔ اس نے قائدِ عوام کو دیکھا تو پورا گھڑا سامنے رکھ دیا۔ یہ پانی خاصا خراب تھا۔ ساتھی گندہ پانی دیکھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، لیکن چیئرمین بھٹو نے کہا کہ میں پانی ضرور پیوں گا، تاکہ ہمیں پتہ چلے کہ اس علاقے کے لوگ کس قسم کا پانی پینے پر مجبور ہیں۔ اور قائدِ عوام نے وہ پانی سیر ہو کر پیا۔

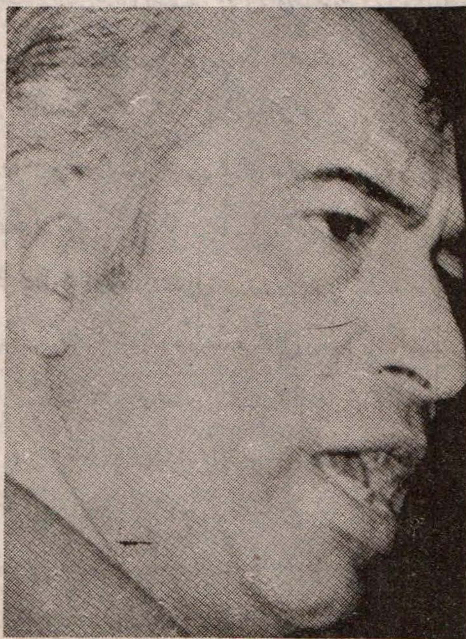
کیا برصغیر کی تاریخ میں کوئی ایسا خالص قائد گزرا ہے؟ یہ کردار ذوالفقار علی بھٹو کی انسان دوستی اور غریب پروری اور اپنے ملک کے غریب لوگوں سے ان کی عقیدت، محبت اور خلوص کی نشاندہی کرتا ہے۔

کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار انھوں نے کراچی کے ایک ہفت روزے کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا۔ "غریب لوگوں کے مسائل طے کرنے کے لیے ان کی حکومت بہت کچھ کر رہی ہے اور ہر علاقے سے انصاف کیا جا رہا ہے۔" کراچی کی ایک بستی لیاری کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے فرمایا، "میں نے اپنی زندگی میں اتنی گندگی اور اتنی غربت کبھی نہ دیکھی ہو گی جتنی میں نے لیاری میں دیکھی ہے۔ شروع سے لے کر جب میں بچہ تھا اس وقت سے میرا جی جلتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا بنوں گا۔ سیاست داں بنوں گا، انجینئر بنوں گا، ڈاکٹر بنوں گا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جو بھی میں بنوں گا۔ مجھے ان کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ کوشش کر کے اپنے ہاتھوں سے ان کی خدمت کچھ نہ کچھ کرنی پڑے۔ جب میں وزیر بنا اس وقت بھی ایوب خاں سے کہا کہ یہ بے چارے انسانوں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے۔ جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔ ان کو تو کسی عجائب گھر میں ڈال دیں یا ایک چڑیا گھر بنائیں۔ دنیا کو بتائیں

کہ یہ پاکستان کا چڑیا گھر ہے یہ بات

نہیں کہ وہاں سندھی رہتے ہیں کہ ہم سندھیوں کے لیے کر رہے ہیں۔ وہاں اکثر بلوچ رہتے ہیں۔ مکرانی رہتے ہیں اور یہ بات ہی نہیں، ہمیں تو سب کی خدمت کرنی ہے جو سب ہمارے پاکستان میں رہنے والے ہیں۔ بلوچستان کو دیکھیں، وہاں ہماری حکومت بھی نہیں۔ وہاں کا ہم نے دوگنا بجٹ کر دیا ہے۔ بلوچستان کی جو اسکیم آتی ہے اسکو سب سے پہلے اور بڑی ہمدردی سے دیکھتا ہوں۔ یہی بات سرحد کے ساتھ ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کے لیے، میڈیکل کالج کے لیے۔ نئی بندرگاہ کی ضرورت ہے اس میں ہم کوشش کر رہے ہیں۔ سرحد کے قبائلی علاقوں کے لیے بھی میں یہی چاہتا ہوں کہ وہاں کھل جائیں۔ اور رنئے راستے بنیں۔ ابھی میں دورے پر گیا تھا۔ میں نے جتنے بھی عطیات ہو سکتے تھے دیئے۔ وزارت خزانہ ناراض بھی ہو گئی۔ آخر میں نے کہا آخر کس کے لیے ہے، پاکستان کے لیے ہی تو ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی یونیورسٹی کے لیے بھی کچھ کریں گے۔ دوسری اسکیمز ہیں۔ سارے ملک کے لیے کرنا ہے۔ اکثریت ہماری پنجاب میں رہتی ہے اور خدمت لوگ کرتے ہیں لوگوں کی اکثریت کی۔ جہاں لوگ رہتے ہیں۔ درد لوگوں کو ہوتا ہے۔ دکھ لوگوں کو ہوتا ہے۔ بھکھ لوگوں کو ہوتا ہے۔ رونا لوگ روتے ہیں، کھانا لوگ کھاتے ہیں، مرتے جیتے لوگ ہیں، سوتے لوگ ہیں۔ تو انسان کی خدمت کرنی ہے۔ ان کی اکثریت پنجاب میں رہتی ہے۔ تو اکثریت کا اپنا حق ہے۔ جو اکثریت کے حقوق ہیں وہ اکثریت کو ملینگے۔ ہمارے پاس امریکہ کی دولت نہیں ہے کہ چاند پر جا کر خرچ کریں۔ چاند پر جا کر دیکھیں کہ چاند کی مٹی کیسی ہے؟ لال ہے، پیلی ہے کہ کالی ہے۔ ان کی جو آمدنی ہے ان کی جو رقم ہے وہ یوں خرچ کر سکتے ہیں، ہمیں اپنی رقم اپنے لوگوں پر خرچ کرنی ہے، اس لیے سب جو اصول میں انصاف کے کہ اکثریت کہاں رہتی ہے؟ دوسرا یہ کہ سب سے زیادہ پسماندہ

سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان اپنی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ وہاں جہاں پانی نہیں ملتا، جہاں بجلی نہیں ہے تو وہاں بھی ہمیں دیکھنا ہے۔ ان کو پہلے دیں — ان کو پہلے دیں، تو توازن رکھنا ہے۔ ہر حکومت کو توازن رکھنا چاہیے۔ توازن میں دیکھنا چاہیے کہ اوپر جا رہا ہے یا نیچے جا رہا ہے۔ جہاں کوئی زیادہ نیچے جا رہا ہے، پھر دوسرے پر وزن زیادہ ڈالنا چاہیے۔ اس طرح سے اگر ہم نے لوگوں کی خدمت کی، یہ چیزیں کوئی چھپا نہیں سکتا۔ اگر اس میں کوئی فراڈ ہے یا فریب ہے یہ بات یاد



دیر تک نہیں چلتی بڑی جلدی کھل جاتی ہے کہ ہر حکومت کہتی ہے سب سے انصاف کریں گے،
لیکن پھر اس کے اعمال سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ
نہیں ہونا چاہیے، وہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں وہاں کا نہیں ہوں۔ یہاں کا نقصان پہنچاؤں گا۔
ایک علاقے کے لوگوں کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں انصاف کر رہا ہوں، یہ کوئی عجیب طریقہ
ہے۔ لیکن ان کو ناجائز فائدے بھی نہ دوں گا۔ اب جناب دیکھیے میں صاف بتاؤں لاڑکانہ
میں تھوڑا بہت تعمیری کام ہو رہا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بھٹو صاحب لاڑکانہ کے ہیں،
لیکن نہیں، میں نے سندھ گورنمنٹ سے کہا ہے ایسے نہیں، بلکہ پہلے کراچی، پھر حیدرآباد،
پھر سکھر، جہاں تک شہروں کا سوال ہے، جہاں تک اضلاع کا سوال ہے، یعنی
مفصّل کا، میں نے کہا ہے ٹھٹھہ، دادو، جیکب آباد، لاڑکانہ، کیونکہ یہ پسماندہ علاقے
ہیں اور اس کے علاوہ لاڑکانے کا شہر اور ضلع سیاسی مرکز رہا ہے شروع سے لیکر اس لیے یہ
وہاں کے ایم این اے۔ ایم پی اے اپنا اثر بہت چلاتے ہیں۔ ان کو آتا ہے اپنا اثر
استعمال کرنا، لیکن پھر بھی میں روکتا ہوں، جہاں تک میں دیکھتا ہوں کہ یہ نہیں ہونا چاہیئے
اور یہ ہونا چاہیے، لیکن جہاں تک دیہات میں بجلی وغیرہ کا تعلق ہے، جہاں بھی ضرورت
ہے اور گھر کونسا ہے، بھئی جو لوگ اپنے اپنے علاقے سے، اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں،
لوگوں کو بھائی سمجھتے ہیں، ہر جگہ جھونپڑی ان کا گھر ہے۔ وہ کہاں بھی ہوں۔ وہ ڈیرہ
اسمٰعیل خان میں ہوں۔ وہ بنوں میں ہوں، وہ لائل پور میں ہوں، اور وہ کراچی میں ہوں
ٹھٹھہ میں ہوں بلوچستان میں ہوں، کوئٹہ میں ہوں قلات میں ہوں لوگ آپ سے خوش
ہوں۔ آپ جائیں تو لوگ آپ کا خیر مقدم کریں۔ تو کیا آپ کا وہ گھر نہیں جہاں وہ آپ
کو اچھے جذبات سے ملیں تو پھر زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ جی پھر سارا ملک اپنا گھر ہے ساری
چیزیں ہر جگہ ترقی کریں، سارا ملک ترقی کرے، جہاں بھی ہم گلشن کر دیں وہ پاکستان ہی

ہوگا۔"

جناب بھٹو کی نظریں ملک کے تمام مسائل کا تنقیدی جائزہ لیتی رہی ہیں۔ وہ ملک کے مسائل سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ تمام مسائل پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے ملک کے عوام سے محبت ہے اس کی شدید خواہش ہے کہ پاکستان کا بچہ بچہ خوش حال ہو جائے یہی سبب ہے کہ انھوں نے اقتدار حاصل کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد ملک میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں جو قابل تحسین ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیری اور انقلابی بھی ہیں۔

۱۵ار مارچ ۱۹۷۲ء یعنی صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے صرف تین ماہ کے اندر ہی جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ریڈیو پاکستان سے تعلیمی اصلاحات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا "آزادی حاصل ہونے کے بعد ہمارے ملک میں تعلیم کے شعبہ کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور عرصۂ دراز سے ہمارے ملک میں یہ فرسودہ خیال عام رہا ہے کہ اس طبقے کے لوگوں میں سے ہی اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ پیدا کیا جائے۔ ہمیں یہ بات نوآبادیاتی نظام سے ورثہ میں ملی ہے اور آزادی کے بعد بھی سیاہ استحصالی قوتیں اس نظریے کو مزید پروان چڑھاتی رہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عرصے میں تعلیمی اخراجات کا بیشتر حصہ اساتذہ، سائنسی آلات اور کتابوں پر خرچ ہونے کے بجائے مناسب شرح سے تعمیرات پر خرچ ہوتا رہا اور صرف اس بنا پر کئی مثالیں ہیں کہ ہمارے پاس عمارات ہیں، لیکن ان میں طالب علم نہیں۔ تجربہ گاہیں ہیں، لیکن ان میں آلات نہیں، اور کلاس روم ہیں، لیکن ان میں اساتذہ نہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو کاہلی کی دلدل سے اس طرح نکالنا چاہیئے کہ ہمارے مذہبی اصولوں کے تقدس کو بھی ٹھیس نہ پہنچے اور ہم اپنی ثقافت کی اعلیٰ روایات سے بھی محروم نہ ہوں یہی نہیں بلکہ

جہاں ہر ایک کو اس کے حصول کے یکساں مواقع میسّر ہوں اور مواقع نسل، مذہب، صنف علاقے اور پیدائش کے امتیاز کے بغیر ہر باشندے کو حاصل ہونے چاہییں۔ ہمیں ایک طرف تو تعلیمی نظام کو جمہوری بنانا ہے اور جلد سے جلد عالمی خواندگی کے معیار تک پہنچنا ہے اور دوسری طرف ہمیں دنیا میں سائنس اور اعلیٰ فنی مہارت کی دوڑ میں حصّہ لینا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بے مقصد عام تعلیم کو زیادہ با مقصد اور زرعی اور فنی تعلیم میں تبدیل کر دیا جائے۔ تعلیم بے مقصد نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے روزگار کے مواقع سے قریب تر ہونا چاہیے، ماضی میں بھی تعلیمی اصلاحات کے منصوبے بنائے جاتے رہے ہیں، لیکن ماضی میں جب بھی تعلیمی اصلاحات نافذ کی گئیں تو ان اصلاحات کو حرفِ آخر قرار دیا گیا۔ اور ان کے نفاذ میں اتنی سختی برتی گئی جیسے فکر انسانی کا آخری شاہکار ہوں۔ اسکا جو نتیجہ نکلا وہ خلاف توقع نہیں تھا۔ گزشتہ تمام تعلیمی اصلاحات کا حشر ان کے لیے لچکدار نہ ہونے کی وجہ سے ہوا۔ اس کے برعکس میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آج جو پالیسی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس کا مسلسل جائزہ لیا جاتا رہے گا اور اس پر عمل درآمد سے جو تجربات حاصل ہوں گے ان کی روشنی میں اس پالیسی کو بہتر سے بہتر بنایا جائے گا۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کے اعلان اور وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کی ۱۶ مارچ ۱۹۷۴ء کی تشریحی تقریروں کی روشنی میں شیڈول کے عین مطابق تعلیمی اصلاحات پر پورے عزم سے عملدرآمد شروع کر دیا گیا، چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۷۲ء سے نجی انتظامات کے تحت چلنے والے ۱۷۵ کالجوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ انہیں ۷۸ کالج پنجاب کے اور ۹۷ سندھ کے شامل ہیں اور نجی انتظامات کے تحت چلنے والے ملک کے تمام کالج

قومی تحویل میں لیے گئے اور ان اسکولوں اور کالجوں میں کام کرنے والے اساتذہ کو وہی تنخواہیں اور دوسری تمام مراعات دے دی گئیں جو سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں کام کرنے والے اساتذہ کو حاصل تھیں۔ ان تمام اسکولوں میں کام کرنے والے جو اساتذہ غیر تربیت یافتہ تھے انھیں بھی سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا اور یہی نہیں، بلکہ ان کو تربیت دینے کے لیے مفید اقدامات بھی کیے گئے۔

اسکولوں اور کالجوں کے قومیانے سے فوری طور پر تقریبًا دس لاکھ طلبا اور قریبًا ۲۶ ہزار اساتذہ مستفیض ہوئے جب کہ سندھ میں تقریبًا ساڑھے بارہ ہزار ور تین لاکھ اڑسٹھ ہزار طلبا کو فائدہ حاصل ہوا۔ اس اسکیم کے تحت سندھ کے علیمی بجٹ میں آٹھ کروڑ روپے کے اخراجات کا اضافہ ہوا۔ کیونکہ ۱۹۷۲ء سے تمام سکولوں میں آٹھویں جماعت تک فیس معاف کر دی گئی۔ ناپسندیدہ اور بدنام نیورسٹی آرڈی ننس کو ختم کر کے یونیورسٹیوں کے لیے نیا قانون نافذ کر دیا گیا اور سابی اور عام مطالعے کی کتابوں کی تصنیف و ترجمے اور چھپائی کے لیے ایک فاؤنڈیشن یم کر دیا گیا ہے۔

بہرکیف نئی تعلیمی پالیسی جتنی جامع ہے اسے محسوس کرتے ہوئے یہ بات رے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ نسل جس کا مطمح نظر محدود اور تی تعصبات سے متاثر ہے نئی تعلیمی پالیسی سے ضرور فائدہ اٹھائے گی، کیونکہ یہ رے لیے ایک نئے اور شاندار مستقبل کا خاکہ پیش کرتی ہے۔ تعلیمی اداروں قومیا لینا بلاشبہ انقلاب کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس سے فرد کے شعور کی تربیت گی اور آنے والی نسلیں ہم سے بہتر زندگی گزار سکیں گی۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اخلاقی اور مادی اعتبار سے گری ہوئی قوم کو اپنے

پاؤں پر کھڑا کرنے کا ذمہ لیا ہے تو یہ بھی ان کا فرض ہے کہ وہ محدود ذرائع کو پیش نظر رکھ کر منصوبہ بندی کریں۔ قرضے لے کر مانگے کے اجالے کا تماشا ہم دیکھ چکے ہیں اور شاندار عمارتوں اور درسگاہوں کی تعمیروں کا نظارہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ قوم کو اب ان منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ وہ پورے خلوص کے ساتھ قائدِ عوام جن کاموں کو انجام دینا چاہتے ہیں ان میں ان کی مدد کریں۔

تعلیمی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے فرمایا تھا "ترقی کی کلید تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جو ریگستان کو لالہ زار میں تبدیل کر دیتی ہے آئیے ہم سب مل کر تعلیم کے لیے جدوجہد کریں اور پاکستان کو کامیابی کے ساحل سے ہمکنار کر دیں۔"

جناب بھٹو کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر کام مشین کی تیزی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ملک کا اقتدار سنبھالنے کے بعد زندگی کے جن شعبوں میں انہوں نے اصلاحات کا فوری نفاذ کیا ان میں زرعی اصلاحات، لیبر پالیسی، صحتی اصلاحات۔ زرعی اصلاحات سے ملک کے مزارعین کی ایک ایسی کثیر تعداد کو فائدہ پہنچا ہے جن کے پاس اپنی زمین نہیں تھی اور وہ محنت کرتے تھے، مگر پھر بھی بھوکے اور ننگے رہتے تھے۔ یہ ایک نہایت جراٴت مندانہ اور انقلابی اقدام ہے، کیوں کہ مستقبل میں اس سے ملک کی زرعی پیداوار میں قابلِ قدر اضافہ ہوگا اور دیہی آبادی کی خوشحالی اور فلاح و بہبود میں حکومت کا یہ دانشورانہ اقدام سنگ میل ثابت ہوگا۔ ان اصلاحات پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

مارچ ۱۹۷۲ء کے آخر میں بھٹو صاحب نے نئی صحت کی اسکیم کا اعلان

ہر کے ملک کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنی بڑی اور جامع اسکیم کو عمل میں لانے کا اعلان کیا جس کی رو سے پاکستان کے ہر شہری کو علاج معالجے کی سہولت میسر ہوئی۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت نے ۳۰۸۰ روپے کی رقم مخصوص کر دی۔ اس سے پہلے کسی قومی صحتی اسکیم کے لیے اتنی خطیر رقم نہیں رکھی گئی تھی۔ اس اسکیم کو نہایت جمہوری انداز سے پیش کیا گیا اور اس کے بارے میں قومی سطح پر بحث و تمحیص بھی کی جا چکی ہے، تاکہ ہر طبقے کو مطمئن کیا جا سکے اور ضروری ترمیمات کے بعد اسے نافذ العمل کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے خاص طور پر ملک کے ڈاکٹر صاحبان کی رائے معلوم کر کے اس اسکیم کی افادیت کو بھی تسلیم کروا لیا تھا۔

عوام کی فلاح و بہبود پر مشتمل اس اسکیم کے تحت ملک بھر میں صحت کے مراکز کا ایک جال بچھایا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دور افتادہ علاقے خصوصاً دیہات کے لیے طبی سہولتیں آسانی سے دستیاب ہو سکیں گی۔ ڈاکٹر صاحبان کی فیس سرکاری طور پر مقرر کر دی گئی ہے اور سرکاری ڈاکٹروں کے لیے یہ لازم قرار دیا دیا گیا ہے کہ وہ پرائیویٹ پریکٹس نہیں کریں گے یا جس جگہ پر ان کی تعیناتی ہے وہاں وہ اپنا روزمرہ کا کام محنت، ایمان داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیں گے۔ اور سرکاری ملازمین کو ان کی طرف سے عدم توجہ کی کوئی شکایت نہ رہے گی۔ عوام کے لیے یہ بات پریشانی کی موجب تھی کہ ڈاکٹر حضرات عوام سے بڑی بڑی فیسیں وصول کرتے تھے۔ مریضوں کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ میڈیکل طلبا اور ڈاکٹروں کے ساتھ بھی انصاف کیا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں بڑی تعداد میں اچھے ڈاکٹروں کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے لیے حکومت نے طبی تعلیم کم

وقت کے اندر اور صحیح انداز میں ترتیب دی تاکہ اچھے ڈاکٹر پیدا ہوں۔ طبی تعلیم کی تکمیل اب پانچ سال کے بجائے چار سال میں ہوا کرے گی۔ میڈیکل کالجوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے انتظامی بورڈ بنائے جائیں گے جن میں سرکاری اور غیر سرکاری ممبر بھی شامل ہوا کریں گے۔

بلوچستان کی تعلیمی اور طبی پسماندگی کے پیش نظر وہاں ایک نیا میڈیکل کالج قائم کیا جا رہا ہے۔ اچھے ڈاکٹروں کی دستیابی کے لیے ان کو پہلے سے بہتر تنخواہیں دی جائیں گی۔ جو ڈاکٹر دیہات میں کام کریں گے ان کو زیادہ مراعات بھی دی جائیں گی۔ اب تک یوں ہوتا چلا آرہا تھا کہ ڈاکٹر تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرونی ممالک کی طرف پیسہ کمانے کی لگن میں کوچ کر جاتے تھے۔ حکومت نے ڈاکٹروں کے باہر جانے اور دوسرے ممالک میں بسنے پر پابندی عائد کر دی۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ اس طرح جو ڈاکٹر صرف روپے کمانے کی لگن کے واسطے بیرون ملک چلے جاتے تھے اب وہ اپنے ہی ملک میں رہ کر عوام کے واسطے کام کریں گے۔

صحت کے میدان میں سب سے بڑا قدم جنرک دواؤں کے قانون کا نفاذ ہے جس کے تحت ہزاروں قسم کی دواؤں کو کم کر کے چند بنیادی یا جنرک دواؤں کی فہرست میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس فہرست میں تقریباً ۲۵۰ دوائیں رہ جاتی ہیں جن کا اپنے اصلی ناموں سے دستیاب ہونا کوئی مشکل بات نہیں۔ اس اقدام سے عوام کو کاروباری طبقے کے مذموم ترین استحصال سے بچایا گیا ہے۔ اب تک ناموں میں ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ دواؤں کی ایک بھرمار تھی جس سے روپیہ بٹورا جاتا تھا۔ حالانکہ بنیادی طور پر وہ سب دوائیں ایک ہی خاصیت کی حامل تھیں۔

جنرک ناموں کی فہرست کے استعمال میں آجانے سے غیر ضروری دواؤں کا خاتمہ ہو گیا اور دوائیں سستی بھی دستیاب ہونے لگیں۔ زیادہ تر دوائیں اب اپنے ملک میں

ہی تیار کی جائیں گی۔ اس طرح صحتی اسکیم سے جو فائدے ہوں گے ان کی حیثیت تو اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن ایک بڑا فائدہ اس اسکیم سے ملک کی اقتصادیات میں انقلابی طور پر یہ ہوگا کہ کسانوں، مزدوروں اور عوام کی صحت قابلِ رشک ہو جائے گی اور اچھی تندرستی کامیابی کی ضامن ہے۔

گزشتہ دو سال کے دوران اقتصادی انصاف اور سماجی بہبود کے لیے جو اصلاحات کی گئیں ان کی مثال کسی ایسے ترقی پذیر ملک میں مشکل ہی سے ملے گی جیسے پاکستان کی طرح زبردست مشکلات اور مسائل کا سامنا ہو۔ عوام کی منتخب شدہ حکومت نے اپنے جمہوری منشور میں کیے گئے وعدوں کی تکمیل کے تقاضے سے حکومت نے مزدوروں کو جو بنیادی مراعات دیں وہ قابل ستائش ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے مزدور طبقے میں یہ ذہنیت پیدا ہو گئی ہے کہ مطالبات پر مطالبات پیش کرو اور کام کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مزدوروں کے اس رجحان سے صنعت کار، مزدوروں کو ملازمت دینے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جب تک مزدور اپنے احساسِ ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیتے بے روزگاری بڑھتی ہی جائے گی اور پیداوار میں کمی صنعتی تعطل کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر حکومت کو سرمایہ کاروں، مزدوروں اور کسانوں کا بے لوث تعاون حاصل ہو جائے اور ملک کے اندرونی و بیرونی سیاسی حالات بہتر ہوتے رہے تو ملک بہت جلد معاشی خوشحالی کی نئی حدود کو چھو لے گا۔

ملک کو خوشحال بنانے کے لئے صنعت کاروں اور مزدوروں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، کیونکہ حکومت کا ہر اقدام ہر شخص اور ہر طبقہ کے لیے یکساں طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر حکومت کے کسی اقدام سے معاشرے کے ایک طبقے کو فائدہ پہنچے گا تو ممکن ہے کہ وہی اقدام دوسرے طبقے کے لیے مناسب نہ ہو۔ کیونکہ

معاشرے میں مختلف طبقوں کے مفادات اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے متصادم ہو ہی جاتے ہیں مگر حب الوطنی اور قومی بہبود کے جذبے کا تقاضا یہ ہے کہ کسی اقدام پر تنقید اور ہائے واویلا مچانے سے پہلے یہ جائزہ لینا چاہیے کہ آیا اس سے ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصے کا بہبود ممکن ہے یا نہیں اور اگر ہے تو پھر معاشرے کے ہر طبقے کا یہ فرض ہے کہ وہ ان اصلاحات کو خندہ پیشانی سے قبول کر لے۔ مثلاً مزدور اور سرمایہ کار کے درمیان ہمارے ملک میں بدقسمتی سے ایک کھچاؤ اور تصادم کی کیفیت آج بھی پائی جاتی ہے، حالانکہ مزدور اور صنعتکار دونوں کا فرض ہے کہ ان پر کھلے دل سے عمل درآمد میں حکومت کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں تاکہ ہماری تجارت، صنعتیں، زراعت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کی رفتار تیز تر ہو سکے اور ملک میں جس نئے دور کا آغاز ہوا ہے اس میں عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ ہموار ہو سکے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو راولپنڈی میں صنعت کاروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، "میں آپ کا مخالف نہیں ہوں۔ میں موجودہ نظام کا مخالف ہوں۔ آئیے ہم ہاتھ ملائیں۔ آپ کے طاقتور ہاتھ اور میرے کمزور ہاتھ۔ ہم مل کر اس نظام کے خلاف جدوجہد کریں۔ آپ کو صنعت کے میدان میں پیش رو بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ مستقبل کی تعمیر اس انداز سے کیجئے کہ ہر صوبہ خوش حال ہو جائے اور آئندہ نسلیں آپ کو دعا دیں۔"

الیکشن سے پہلے چیئرمین بھٹو نے عوام سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ جب وہ برسرِ اقتدار آئیں گے تو حج پر سے پابندی کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد جہاں جناب بھٹو نے اصلاحات کیں وہاں حج سے تمام پابندیاں ہٹالی گئیں اور اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے حکومت نے ۱۹۷۳ء میں ۵۸ ہزار عازمین حج کو بحری جہاز سے اور بارہ ہزار کو خشکی

اور ہوائی جہاز کے ذریعے بھیجنے کے انتظامات کیے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور حج کی عالمی تاریخ میں حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ بھی۔ عازمین حج کی خشکی کے راستے جو ایک بڑی تعداد روانہ ہوئی اس کے لیے ہر قافلے کا ایک پارٹی لیڈر مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور دواؤں کا مکمل انتظام بھی کیا گیا۔ اس طرح پاکستانی حاجیوں کی بڑی تعداد عالم اسلام میں شامل تھی۔ اس مقدس موقع پر وزیر اطلاعات و حج و اوقاف جناب جناب مولانا کوثر نیازی صاحب نے بہت اچھا لٹریچر تیار کرایا جو پاکستان کے تعارف کے لیے وہاں تقسیم کیا گیا، نیز حاجیوں کی رہنمائی کے لیے بھی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

گزشتہ جنگ نے ہماری حیثیت کو زبردست بحران میں ڈال دیا تھا ایسے حالات میں حکومت پاکستان کا یہ پرجوش عمل حج کی تاریخ میں ایک ایسا اسلامی کارنامہ ہے جو صرف وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کے دلوں میں اسلام کی شمع روشن ہے اور جو مذہب سے بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک متوازن اور انصاف پسند ذہن کے مالک ہیں۔ وہ انسان دوست، خدا ترس اور ایک شفیق رہنما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے غریب طبقے سے بہت محبت ہے۔ وہ محنت کشوں سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنے عہد کے اتنے کم عرصے میں انھوں نے یہ بات ثابت کردی کہ وہ خالص عوامی لیڈر ہیں، مگر بدقسمتی سے ان کی حکومت کو کئی المناک حادثات سے دوچار ہونا پڑا اور حالات نے سنگین صورت اختیار کرلی۔ ان حالات کو بگاڑنے میں حزب اختلاف کے رہنماؤں کا بھی ہاتھ شامل رہا۔ حزب اختلاف کا رویہ حکومت کے ساتھ یہی رہا ہے کہ وہ ہمیشہ جائز اور ناجائز تنقید کا نشانہ حکمران پارٹی کو بناتی رہی

ہے۔ آئین کا مسئلہ ہو یا لسانی مسئلہ، زبان کا مسئلہ ہو یا صوبوں کا، حج کا مسئلہ ہو یا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا، مزدوروں کا مسئلہ ہو یا سرمایہ کاروں کا غرض ہر مسئلہ ایسا ہے جس پر حزب اختلاف کے لیڈروں نے ہاہاکار نہ کی ہو، مگر یہ بھٹو صاحب کی شخصیت کا انفرادی پہلو ہے کہ وہ ہر لمحے کے ساتھ سمجھوتا کرنا خوب اچھی طرح جانتے ہیں،



محترمہ نصرت بھٹو ایک ثقافتی تقریب میں

چنانچہ ان تمام مسائل پر بھٹو صاحب نے پورا پورا قابو حاصل کیا اور تمام طبقوں کو مطمئن کرنے کی پوری پوری کوشش بھی کی۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ کچھ غرض سیاست داں اپنی اجارہ داری قایم رکھنے کے لیے آج بھی ایسے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں جس سے حکومت کو وقتی طور پر پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ستاروں کی روشنی بجھ چکی ہے۔ جانور ہمیں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ ہم وقت کے شہپر پر تنہا کھڑے ہیں۔ تاریخ شکست کھا چکی ہے۔ ایسے عالم میں ہم آہ تو کر سکتے ہیں، لیکن دیر اور کسی مدد کا انتظار نہیں۔

آیئے ایک انسان جو خدا کی طرف سے رحمت بن کر ہمارے درمیان موجود ہے اس کا ہاتھ خلوص کے ساتھ بٹائیں۔ اسی میں ہماری فلاح و بہبود ہے۔

ایک انسان جو انسان دوست بھی ہے، غریب نواز بھی، رحمدل بھی اور مادرِ وطن پر مر مٹنے کا عزم بھی رکھتا ہے وہ یقیناً فرشتہ نہیں، بلکہ ہمارا جیسا ایک انسان ہی ہے۔ انسان جو غلطیاں بھی کرتا ہے، گناہ بھی کرتا ہے، محبت بھی کرتا ہے، نفرت بھی کرتا ہے عزم بھی رکھتا ہے اور نئے ولولوں اور نئی امنگوں سے دوسرے لوگوں کے لیے خضرِ راہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اور وہ جو یاس و آس میں نئے سویرے کا امین بھی ہے۔

تاریخ کا سُنہرا باب

پاکستان کے نوّے ہزار جنگی قیدیوں کا مسئلہ پاکستان کا ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے اس روشن اور مہذب معاشرے کا بھی ایک اہم مسئلہ تھا، جہاں پر لوگ جنگ سے نفرت اور امن کے گیت گانے کے خواہاں ہیں۔ ڈاکٹر والڈ ہیم کے برِصغیر کے دورے کے موقع پر جنگی قیدیوں کا مسئلہ جس طرح پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا تھا اسے بالواسطہ طور پر جناب "بھٹو" کی ڈپلومیسی کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے جن نامساعد حالات میں باگ ڈور سنبھالی تھی وہ ان کے لیے سب سے بڑی آزمائش تھی۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت کے ساتھ جو کامیابی حاصل کی وہ اس نظام کی دلیل تھی جو پارٹی پاکستان میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے چلانا چاہتی تھی۔

اس مقدس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے جناب بھٹو نے کام کا آغاز کیا۔ اس سفر میں انھیں لاتعداد مسائل اور ان گنت بحرانوں اور بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں ملک کے کھوئے ہوئے وقار سے لیکر مقبوضہ علاقوں کی واپسی، اپنے فوجی جوانوں کی رہائی کا مسئلہ، آئین کے بحران کا مسئلہ، سیلاب کی تباہ کاریاں اور اندرون و بیرون ملک کے نہ جانے کتنے الجھے ہوئے مسائل شامل تھے۔

اگست ۱۹۷۳ء میں جس سیلاب نے پاکستان میں جس انداز سے تباہی مچائی اس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ پنجاب کے ۱۹ میں سے تقریباً ۱۶ اضلاع مکمل طور پر طغیانی کی زد میں آگئے۔ سیالکوٹ کے قصبے اور دیہات بری طرح زیر آب ہوگئے۔ گوجرانوالہ کا ضلع پہلے بارش اور پھر سیلاب کی زد میں آکر بری طرح متاثر ہوا۔ رحیم یار خاں کے قریب ۳۶ ہزار ایکڑ زمین پر تیار شدہ فصل برباد ہوگئی۔ دوسری طرف دریائے جہلم کے پشتے میں بھی شگاف پڑ گیا جس کی وجہ سے بے شمار دیہات صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ پانی کے زبردست دباؤ کی وجہ سے پنج ند

کے بند میں بھی شگاف پڑ گیا جس کی وجہ سے رنگ پور، ملتان وغیرہ کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہ تاریخ کا عظیم ترین سیلاب تھا جس نے پاکستان بھر میں قیامت برپا کر دی تھی۔

اس سیلاب کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے جناب بھٹو نے تمام متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور بذاتِ خود بحالی آبادیوں کی منتقلی اور امدادی کارروائیوں کی نگرانی کی۔ وزیر اعظم بھٹو جہاں بھی سیلاب سے تباہ کاری ہوتی وہاں پہنچ جاتے۔ انھوں نے جس تدبر اور حوصلہ مندی سے اس وقت جس طرح متاثرہ لوگوں کی ہمت افزائی کی وہ قابلِ تحسین ہے۔

جناب بھٹو نے اس وقت بھی قوم کو جگایا، نئے ولولے بیدار کیے اور ایک نیا عزم بخشا، تاکہ قوم اس نازک اور کڑے وقت میں بھی حوصلہ اور عزم رکھتے ہوئے حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرے اور ایک آفتِ ناگہانی کو سنہری موقع میں تبدیل کر دے۔

جناب بھٹو نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، "اگر ہم زیادہ سے زیادہ گندم پیدا کریں تو ہماری معیشت دوبارہ بحال اور مستحکم ہو سکتی ہے۔ ہمیں لازمی طور پر خود کفیل بننا ہے بلکہ گندم جیسی ضروری جنس کی پیداوار کو اپنی ضرورتوں سے بھی زیادہ بڑھانا ہے۔ اس وقت پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ اس لیے زیادہ دشوار نہیں کہ سیلاب نے اپنے پیچھے ہمارے کھیتوں اور زمین میں دور دور تک نمی چھوڑی ہے۔ اور کھاد بھی کافی مقدار میں مہیا ہے۔ اگر ہم اس سال اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے تو پھر کبھی بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔"

دراصل اس وقت ملک کئی اہم مسائل سے دوچار تھا۔ ایک طرف ہندوستان ہمارے

پانچ ہزار مربع میل علاقے پر قابض تھا اور دوسری طرف ہمارے نوّے ہزار قیدی اس کے اسیر تھے۔ جناب بھٹو نے مسز اندرا گاندھی سے مذاکرات کیے اور نتیجہ شملہ مفاہمت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس کے تحت ہمارا مقبوضہ علاقہ ہمیں واپس مل گیا۔

ان تمام مسائل کے باوجود جناب بھٹو کے سامنے اصل اور داخلی مسئلہ دستور کا تھا۔ جناب بھٹو نے ایک ایسا دستور تیار کیا جو ملک کی سالمیت اور مرکزیت کا ضامن ہے اور صوبائی خود مختاری کا بھی حامل ہے۔ بلاشبہ اب پاکستان کا دستور ایک مکمل دستور ہے جسکا اعتراف حزب اختلاف کے لیڈروں نے بھی کیا۔

پاکستان کے نوّے ہزار جنگی قیدیوں کا مسئلہ پاکستان کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ بیسویں صدی کے اس روشن اور مہذب دور کا بھی ایک اہم مسئلہ تھا جہاں پر لوگ جنگ سے نفرت اور امن کے گیت گانے کے خواہاں ہیں اور امن کی روایتوں کو زندہ رکھنے کے لیے جنگ سے نفرت کا اظہار گاہے گاہے کرتے رہتے ہیں۔ جنگ جو دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ ویت نام میں برسوں اور نسلوں کی جنگ جاری رہی مگر جب یہ جنگ بند کردی گئی تو وہاں سب سے پہلے یہ اعلان کیا گیا کہ ایک دوسرے کے جنگی قیدی واپس کر دیے جائیں گے اور جنگ بندی کے بعد اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا، دنیا بھر کے اخبارات نے بجا طور پر دنیا کی توجہ پاکستان کے جنگی قیدیوں کی طرف مبذول کرائی اور زور دیا کہ یہ جنگی قیدی تعداد میں بہت زیادہ ہیں چونکہ جنگ ختم ہوئے ایک مدت ہو چکی تھی۔ شملہ معاہدہ کے تحت علاقے بھی خالی کیے جا چکے تھے، جنیوا کنونشن کی قراردادوں کے مطابق جنگی قیدیوں کو اسیر رکھنے کا کوئی جواز نہیں

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کرٹ والڈہیم کی آمد پر بولے پاکستان نے یک زبان

ہوکر ان پر واضح کر دیا تھا کہ برِصغیر کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ بھارت سے پاکستان کے جنگی قیدیوں کی واپسی کا ہے اور برِصغیر میں اس وقت تک امن کی فضا قایم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان ۹۰ ہزار انسانوں کو واپس ان کے خاندانوں میں بھیجا جائے گا۔

لیکن خیال تھا کہ نوّے ہزار انسانوں کو ایشیا کی سب سے بڑی جمہوری حکومت اپنے سیاسی مفادات اور ہوس ملک گیری کی تکمیل کے لیے اپنی سرزمین پر قید رکھنا چاہتی ہے۔ امریکا اور برطانیہ کے اخبارات کے علاوہ خود ہندوستان کے اخبارات نے اس مسئلے کے سلسلے میں آواز اٹھائی اور ہندوستان کے سوتے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی۔

یہ بات قابلِ تعریف اور قابلِ فخر ہے کہ ڈاکٹر والڈ ہیم کے برِصغیر کے دورے کے موقع پر جنگی قیدیوں کا مسئلہ جس طرح پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا تھا اسے بالواسطہ طور پر جناب بھٹو کی ڈپلومیسی کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ شملہ معاہدے کے تحت اگر ہمارے ملک کے مقبوضہ علاقے خالی نہ ہوئے ہوتے تو اس وقت یقیناً تمام تر توجہ جنگی قیدیوں کے مسئلے پر مرکوز نہ ہوئی ہوتی اور یہی بات معاہدہ شملہ کی کامیابی کی پختہ دلیل ہے۔ نہیں تو آج تک دنیا میں کسی جگہ مقبوضہ علاقے اتنی جلدی خالی نہیں کیے گئے ہیں۔ اسرائیل نے آج تک عربوں کے علاقے خالی نہیں کیے ہیں البتہ جنگی قیدی واپس ضرور کر دیے گئے تھے۔

یہ بات بھی قابلِ اطمینان تھی کہ دنیا بھر کی رائے عامہ پاکستان کے حق میں ہموار ہو رہی تھی اور اس طرح ہندستان کا ضمیر بھی دنیا بھر میں بدسوا ہو رہا تھا۔ عالمی رائے عامہ کے پاکستان کی طرف جھکاؤ میں جناب بھٹو کی کوششوں کو پورا دخل تھا جنگی قیدیوں کا مسئلہ ایک انسانی مسئلہ تھا اور یقیناً ایک ایسا واحد مسئلہ

میں تھا جس میں حکومت اور حزب اختلاف کی رائے ایک ہو سکتی تھی اور بھارت اور بنگلہ دیش کی مذموم کوششوں کا مشترکہ مقابلہ کیا جا سکتا تھا، مگر یہ بڑے دکھ کی بات رہی کہ ڈاکٹر والڈہیم کے دورے کے موقع پر اگرچہ یک فکری اور یک جہتی کا مظاہرہ کیا گیا، لیکن حزب اختلاف کے بیانات میں پھر بھی ایک بیگانگی رہی اور ایسا احساس ہوا کہ اس وقت بھی وہ شعوری طور پر جناب بھٹو سے ہمدردی یا اتفاق رائے نہیں رکھتی، حالانکہ اس انسانی مسئلہ پر پوری دنیا پاکستان کے نقطہ نظر کی حمایت کر رہی تھی۔

آخر کار پاکستان کے عوام کا عزم و استقلال رنگ لایا۔ حق و انصاف کی جیت ہوئی اور ہمارے جیالے بھائی قید و بند کی صعوبتوں سے آزاد ہوئے۔

اقتدار کی باگ ڈور سنبھالتے ہی جناب بھٹو نے یکے بعد دیگرے ایسے اقدامات کیے جن سے ٹوٹے ہوئے دلوں میں جان پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مرجھائے چہرے کھل اٹھے اور مردہ جسموں میں زندگی بیدار ہو گئی اور قوم ایک نئی اور پر اعتماد فضا میں سانس لینے لگی۔

جناب بھٹو کو جہاں ورثہ میں اور بہت سے مسائل ملے ان میں جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ اپنی جگہ بے انتہا اہمیت کا حامل تھا۔ ایک طرف بنگلہ دیش تھا جو اپنے تسلیم کیے جانے سے پہلے کسی بات چیت کے لیے تیار ہی نہ تھا، دوسری طرف ہندوستان تھا جو اس بات کے درپے تھا کہ پاکستان مجبور ہو کر اصولوں کو قربان کر دے اور سیاسی سودے بازی پر آمادہ ہو جائے، مگر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی فہم و فراست، سیاسی بصیرت اور عزم و استقلال نے اصولوں پر سمجھوتہ کرنے سے بالکل انکار کر دیا اور دنیا کو صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ پاکستانی قوم مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار

ہے لیکن اصولوں پر ہرگز کوئی سودے بازی نہیں کرے گی۔

یہ حق اور انصاف کی آواز تھی جس پر ساری قوم نے لبیک کہا یہاں تک کہ جنگی قیدیوں کے لواحقین نے بھی جس عزم و حوصلہ اور استقلال کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

الغرض اس کشمکش میں دن، ہفتے، مہینے گزر گئے۔ اس دوران حکومت نے عالمی رائے عامہ کو جھنجوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے سرکاری سطح پر بہت سے اقدامات کیے۔ یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا، بلکہ خالص انسانی مسئلہ تھا، اس لیے عالمی رائے عامہ بڑی آسانی سے پاکستان کے موقف کے حق میں ہموار ہو گئی، کیونکہ پاکستان کا موقف اصول و انصاف پر مبنی تھا۔

چنانچہ شملہ معاہدہ کے تقریباً ایک سال بعد ہندوستان و پاکستان کے درمیان ایک دوسرا سمجھوتہ ہوا اور اس سمجھوتے میں انسانی مسائل کے حل پر زور دیا گیا۔ معاہدہ دہلی میں ہندوستان سے جنگی قیدیوں، پاکستان سے بنگالیوں اور بنگلہ دیش سے پاکستانیوں کی واپسی کی شرائط طے کی گئیں، البتہ ۱۹۵ فوجی افسروں کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ان کے متعلق یہ طے پایا کہ ان پر اس وقت تک مقدمہ نہ چلایا جائے گا جب تک یہ مسئلہ سہ فریقی کانفرنس میں طے نہ پائے اور دوسرے یہ کہ انہیں ہندوستان ہی میں رکھا جائے گا۔ اس معاہدے کو بنگلہ دیش نے بھی قبول کیا اور ساری دنیا میں اس معاہدے کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس سمجھوتے کے تحت پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ ۲۸ ستمبر ۷۳ء کو شروع ہو گیا۔

لگا ہے گا ہے شہریوں اور جنگی قیدیوں کی واپسی شروع ہو گئی، مگر ۱۹۵ پاکستانی فوجی افسروں کے مستقبل کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ افسوس یہ مسئلہ ایک بار

سپرد تعطل کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف شیخ مجیب الرحمان کی ضد تھی کہ وہ سہ فریقی کانفرنس میں اس وقت تک شریک نہ ہوں گے جب تک پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرتا۔ دوسری طرف پاکستان کا موقف یہ تھا کہ باہمی گفت و شنید کے بغیر اور ۱۹۵ فوجی قیدیوں کے مسئلے کے حل کے بغیر بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اسی دوران پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس فروری ۱۹۷۴ء میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر بعض مسلم سربراہوں نے خواہش ظاہر کی کہ بنگلہ دیش کے سات کروڑ مسلمانوں کو عالم اسلام کے اس فقید المثال اجتماع میں شریک کیا جائے۔ جناب بھٹو کو اس سلسلے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، چنانچہ پاکستان کی جانب سے بنگلہ دیش کو دعوت شرکت لے کر اسلامی ملکوں کا ایک وفد ڈھاکہ پہنچا، لیکن شیخ مجیب الرحمن نے وہی اصرار کیا کہ پہلے پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے تو وہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں شریک ہوں گے۔

چنانچہ معاملہ پھر الجھ گیا۔ جیسا کہ وزیراعظم جناب بھٹو نے خود اعتراف کیا کہ یہ بڑا مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا، جناب بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا فیصلہ الجزائر، مصر، کویت اور دوسرے دوست اسلامی ممالک کے مشورے پر کیا تھا جنھوں نے اسلامی کانفرنس کے موقع اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس طرح یہ مسئلہ پاکستان کا مسئلہ نہ رہا بلکہ سترکروڑ مسلمانوں کا مسئلہ بن گیا تھا، اسلئے اسلامی اخوت کی خاطر پاکستان نے اپنے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر انتہائی باوقار طریقے سے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔

یہ بڑا جرأت مندانہ فیصلہ تھا اور ساری دنیا میں اسے بہت سراہا گیا۔ اس طرح شیخ مجیب الرحمن اسلامی سربراہی کانفرنس میں شریک ہوئے۔

جب شیخ مجیب الرحمٰن لاہور پہنچے تو ان کا نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا، دونوں لیڈر گلے ملے، گلے شکوے جاتے رہے، بھائی بھائی سے بغل گیر ہوا۔ اس فیصلے کی وجہ سے خیر سگالی اور مفاہمت کی فضا پیدا ہو گئی جس کی بدولت تمام مسائل بحسن و خوبی حل ہو گئے۔ اس طرح پاکستان کی جانب سے بنگلہ دیش کو تسلیم کیے جانے پر سہ فریقی کانفرنس کی راہ ہموار ہو گئی، چنانچہ تینوں ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس نئی دہلی میں ۵ راپریل سے ۹ راپریل تک ہوئی اور خدا کا شکر تھا کہ ایک سمجھوتے پر دستخط ثبت کیے گئے، جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ طے پایا کہ ۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدی دوسرے قیدیوں کے ساتھ پاکستان واپس بھیج دیے جائیں گے، کیونکہ بنگلہ دیش کی حکومت نے ان پر مقدمہ چلانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس سہ فریقی معاہدے کے مطابق پاکستان کے تمام جنگی قیدی باعزت اور غیر مشروط طور پر وطن واپس آ گئے اور جنگی قیدیوں کی واپسی کے ساتھ ساتھ ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ختم ہوا۔ رُسوائی کا ایک داغ دھل گیا۔

جناب بھٹو نے ہندوستان سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو کچھ پاکستان نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کھو دیا تھا۔ اور اس طرح جناب بھٹو نے اپنا وہ وعدہ بھی پورا کر دیا جو انھوں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو برسراقتدار آنے پر قوم سے کیا تھا۔

ہندوستان کے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ "پرتاپ" نے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی ذہانت، سیاسی بصیرت، ولولہ انگیز قیادت کو ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اپنے اداریے میں یوں تحریر کیا ہے: "مسٹر ذوالفقار علی

بھٹو اس شکست خوردہ دیش کے نئے راشٹرپتی بنے ہیں۔ پاکستان کی یہ درد شا بنانے میں ان کا کافی ہاتھ رہا ہے۔ لیکن اگر دیش کی درد شا نہ ہوتی تو شاید وہ اس کے راشٹرپتی کبھی نہ بنتے، بہر حال انہیں وراثت میں ایک شکست خوردہ دیش کی حکومت ملی ہے جسکے ۵ ہزار مربع میل رقبے پر بھارت کا قبضہ ہے جسکے ۹۰ ہزار فوجی اور شہری بھارتی قید میں ہیں۔ جس کی اپنی دھرتی پر بے شمار بنگلہ دیش کے شہری ہیں جنھیں وہ نکال دینا چاہتا ہے۔ جسکے سابق صوبہ مشرقی بنگال کی جنتا پاکستانیوں کو کوس رہی ہے اور لعن طعن کر رہی ہے اور جس کے بے شمار فوجیوں پر غیر انسانی مظالم کے الزام میں ایسے مقدمے چلنے والے ہیں جن میں سارے دیش کا نام ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جائے گا۔"

اسی اخبار کے مدیر جناب للت موہن نے ۲۶ فروری ۷۴ء کے اداریہ میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا: "شری ذوالفقار علی بھٹو اب پاکستان کے پردھان منتری ہیں، لیکن ان کے پاس اختیارات اتنے ہی ہیں جتنے کہ پہلے بطور دیش کے راشٹرپتی ان کے پاس ہوا کرتے تھے۔ ان کی سرکار اسلامی دنیا کی کانفرنس کی میزبان بننے میں فخر محسوس کر رہی ہے۔ پانچ ہزار مربع میل رقبہ جس پر بھارت کا قبضہ تھا وہ اسے واپس مل چکا ہے اس کے قیدی شہری اور فوجی واپس آ رہے ہیں۔ اسکی دھرتی پر آباد بنگلہ دیشی وہاں سے واپس جا رہے ہیں۔ اس کے سابقہ صوبہ جسے اب "بنگلہ دیش" کہتے ہیں کے پردھان منتری شیخ مجیب الرحمان "مجیب بھٹو بھائی بھائی" کے نعروں کے ساتھ منتری بھٹو سے بغلگیر ہو رہے ہیں اور جن مقدموں کی پاکستان سرکار کو فکر تھی ان کے رد ہو جانے کے بارے میں واضح اشارہ مل چکا ہے۔

یہ شری بھٹو کے ایک قابل تعریف کارنامہ کی تصویر ہے۔ اپنے دیش کی اندرونی حالت کے لیے انھوں نے کیا کیا ہے یا کیا نہیں کیا، یہ ایک الگ سوال ہے۔ اپنی خارجہ پالیسی میں جو کچھ انھوں نے حاصل کیا ہے اس کی نہ چاہتے ہوئے بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء اور فروری ۱۹۷۴ء کی پاکستان کی حالت میں انقلابی تبدیلی آچکی ہے۔ دو سال اور دو ماہ کے قلیل عرصے میں صرف اپنی ہوشیاری سے انھوں نے اپنے دیش کو شکست کی لگ بھگ تمام تر ذلتوں سے نجات دلادی ہے اور بدلے میں انھوں نے کیا دیا؟ انھوں نے دیا ایک کاغذ کا ٹکڑا جسے شملہ سمجھوتہ کہتے ہیں اور ایک دوسرا کاغذ کا ٹکڑا جسے دلی سمجھوتے کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر انھوں نے کچھ اور دیا ہے تو اسے بھارت سرکار نے بڑی خوبی سے چھپا رکھا ہے۔ بھارت سرکار مانے یا نہ مانے حقیقت تو یہ ہے کہ میٹھی میٹھی باتیں کر کے بھٹو صاحب اس کا اچھا خاصا الّو بنا گئے ہیں۔ اتنا کچھ لے گئے اور بدلے میں ہم نے شملہ میں مدبھاو نا بڑھانے کا گول مول وعدہ ہی لیا جس کی کئی بار خلاف ورزی بھی ہو چکی ہے اور دلی میں بنگلہ دیش نے بہاری مسلمان واپس لینے کا وعدہ لیا تھا لیکن وہ پورا نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہی ہوگا۔

دلی میں یہ بھی فیصلہ ہو چکا تھا کہ پاکستان کی رضامندی کے بغیر کوئی مقدمے نہیں چلیں گے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵ جنگی قیدی بھی رہا ہو جائیں گے، کیونکہ جب مصر کے پردھان منتری شری سادات سے دلی میں پوچھا کہ ان ۱۹۵ قیدیوں کا کیا ہوگا، تو انھوں نے کہا، "پہلے تو شری بھٹو نے بڑا عجبات مندانہ فیصلہ کیا بنگلہ دیش کو مان لینے کا، اور اس کے لیے ہم ان کی تعریف کرتے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بھائی مجیب کا بھی (مناسب) رد عمل ہوگا۔

اس کا مطلب صاف ہے۔ اب غیر انسانی جرائم کے الزامات کے مرتکب

۱۹۷۵ء تک نظر بندی بھی واپس پاکستان پہنچ جائیں گے۔ بے شک اس میں چند ایک ماہ زیادہ لگ جائیں۔ جب ہمارے دیش کی نیتا ان کرالو داع سے اور بنگلہ دیش کے نیتا لاہور کے شاندار خیر مقدم کی یادوں سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اس سوال پر مزید غور کرنا چاہیئے کہ کیا وجہ تھی کہ ڈپلومیٹک مقابلے میں ترپ تو تمام ہمارے ہاتھ میں تھے لیکن بازی شری بھٹو جیت لے گئے۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں یہ رائے کہ ہندوستان کے اکثریت کے ایک بڑے روزنامہ کی ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی بھٹو صاحب کی سیاسی بصیرت ذہانت، عقل و فہم کی اس انداز میں تعریف کرنے پر مجبور ہے۔ یہی نہیں بلکہ عالمی پریس نے بھٹو صاحب کی کارگری اور پرجوش تپاک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ پاکستان کے عوام کے لیے باعث فخر ہے۔

آیئے عہد کریں

سہ فریقی معاہدے نے پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان خوشگوار فضا قایم کر دی ہے۔ گزشتہ ۲۷ برسوں کی تلخیوں اور سیاسی کشیدگیوں نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ برصغیر میں امن کا ایک نیا باب وا ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ جناب بھٹو کشمیر کے مسئلے کو بھی پُر امن طور پر مزید حل کر لیں گے جس کے لیے پاکستان اور کشمیر کے مظلوم عوام ان کی طرف پُر امید نظریں جمائے ہوئے ہیں اور یقیناً برصغیر کے کروڑوں لوگ اب اس دن کے منتظر ہیں جب حقیقت پسندی، عقل، جذباتی، نسلی اور مذہبی تعصب پر غلبہ پالیا جائے گا۔

پاکستان کے عوام کو جو نئے سرے سے جناب بھٹو نے نیا اعتماد بخشا ہے اور جس انداز سے لوگوں کے حوصلے بلند کیے ہیں اور جس انتہائی نازک موقع پر ملک کو

سنبھالا ہے اور جس طرح سیاسی تدبر سے کام لیا ہے اس کے لیے پاکستان کے ہر فرد کا دل خدا کی حمد اور سپاس و تشکر کے جذبوں سے پر ہے۔

یہ پاکستان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے ایک ایسا رہنما مل گیا جو ذہانت سیاسی بصیرت، علم و حکمت سے مالامال ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کی رائے کو افضلیت اور اہمیت دیتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو خدا نے ایک درد بھرا دل عطا کیا ہے اور وہ بچپن ہی سے اپنے ملک کو خوش حال دیکھنے کے خواہاں ہیں اور آج جب کہ وہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہیں وہ شب و روز جد و جہد میں مصروف ہیں۔ وہ پاکستان کو خوشحال بنانا چاہتے ہیں۔

مگر کچھ مسائل ایسے ہیں جن کا واحد حل عوام اور صرف عوام ہیں، بغیر عوام کے جناب بھٹو بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو وہ چاہتے ہیں، کیونکہ ان کا قول ہے "عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں"

یہ مسائل ہمارے اپنے داخلی ہیں۔ ہمارے اپنے پیدا کردہ۔

آیئے ملکی اور قومی جذبے سے سرشار ہو کر اپنے پیارے قائد کا ہاتھ بٹائیں۔ صوبائی نفرت کے اس درخت کو ڈھا دیں جو کبھی کبھی پرسکون فضا میں مکدر ماحول پیدا کر دیتا ہے، کیونکہ نفرت انسان کی سب سے بڑی کمینگی ہے جو ترقی کی راہ میں پہاڑوں کی طرح ایستادہ ہو جاتی ہے اور محبت دنیا کا سب سے خوبصورت نام ہے جو دنیا کے تمام تر جذبوں سے زیادہ قوی تر ہے۔ جو انسانوں کو حوصلہ بخشتا ہے نئے ولولوں سے آشنا کرتا ہے اور امن کا وہ پھول اگاتا ہے جو قومی یکجہتی، بھائی چارے، اخوت و آشتی، ترقی و کامرانی کی پربہار منزل کی طرف قوموں

کو گام زن کر دیتا ہے۔

جب کبھی پیارے وطن میں صوبائی تعصب کی زہریلی ہوا چلتی ہے تو میں بے اختیار جذباتی ہو کر سوچتا ہوں۔ خداوندا! یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا یہ وہی قوم ہے جو چالیس سال پہلے برطانوی سامراج کے مقابلے میں ایمان، اتحاد اور تنظیم کے پرخلوص جذبات سے سرشار تھی؟ جس نے اپنے سینوں پر گولیاں ہنس ہنس کر کھائیں اور جس کے رہنماؤں نے جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کی خوبصورت ترین لمحات گزار دیے۔ کیا یہ وہی قوم ہے جو قائداعظم کے ایک ہی نعرے پر لبیک کہہ کر بمبئی سے پشاور تک ایک ہو گئی تھی۔

میری آنکھوں تلے تاریخ کے وہ خونی ورق بھی چلے آتے ہیں جو ۴۷ء۱۹ء کے فسادات کے نام سے موسوم ہیں۔ وہ راتیں کتنی اندھیری اور خون رنگ تھیں، میں سوچتا ہوں اور آج بھی معصوم بچوں کی دل گداز چیخیں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے وہ معصوم کنواریاں بھی نہیں بھولتیں جو سنگدل القلب درندوں کی ہوس کا شکار ہو گئیں اور ان سب کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے لیے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک الگ خطۂ ارض حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

مجھے ستمبر ۱۹۶۵ء کی وہ ستمگر شامیں بھی یاد آتی ہیں کہ جب ہم سے پانچ گنا بڑے دشمن نے چوری چھپے اپنے ناپاک عزائم کے ساتھ پنجاب پر حملہ کر دیا تھا اور اس وقت ہمارے ملک کا ہر فرد جاگ اٹھا تھا۔ سارا بنگال جاگ پڑا تھا، سندھ جاگ پڑا تھا، کراچی جاگ اٹھا تھا۔ مکران کے بہادر جاگ اٹھے تھے اور چاٹگام سے لیکر درۂ خیبر تک کے مزدور جاگ اٹھے تھے۔ سب کا جذبہ ایک تھا سب کے نعرے ایک تھے۔

پنجاب کی سرحدوں پہ گولہ باری ہوتی تو ملک کا بچہ بچہ کرب اور اضطراب محسوس کرتا تھا اور اسی جذبے نے اپنے سے پانچ گنا دشمن کے کالے منصوبوں پہ پانی پھیر دیا اور خود دشمن فتح و کامرانی کے خواب لے کر آیا تھا، شرمسار ہو کر چلا گیا۔ یہ جذبہ ناقابلِ تسخیر تھا اور جب تک کسی قوم میں ایسا جذبہ ہو اسے دنیا میں بڑی سے بڑی طاقت بھی شکست نہیں دے سکتی۔

مگر افسوس اس جذبے کی آج جتنی ضرورت تھی اتنا ہی اس جذبہ کی شدت میں کمی ہے اور آج کوئی غدار وطن، مفاد پرست اچھی بھلی فضا میں صوبائی تعصب کا تیر پھینک دیتا ہے تو لمحہ بھر میں فضا مکدر ہو جاتی ہے۔ سارے اچھے جذبے دم توڑ دیتے ہیں اور انسان کی فطری کمینگی جاگ اٹھتی ہے۔

آج جب کہ پاکستان اپنی عمر کے ۲۷ سال گزار چکا ہے اور وہ المیہ بھی گزر چکا ہے جو اس ملک کی تاریخ میں ہمیشہ زخم بن کر مہکتا رہے گا۔ ملک کا اکثریتی حصہ ہم سے الگ ہو چکا ہے۔ اس زوال، افسردگی، مایوسی اور احساسِ شکست سے ہمارے دل ٹوٹ گئے ہیں اور روح زخم زخم ہے اور ہمارا ماڈل سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔ آخر یہ سب کیوں ہے؟ یہ سب اس لیے ہے کہ ہماری سوچ اور فکر دم توڑ چکی ہے اور آج ہم صوبائی تعصبات کا شکار ہیں۔ زبان کا مسئلہ کھڑا کر کے بھائی بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھاتا ہے گھیراؤ جلاؤ کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھائی جاتی ہے۔ فضا سازگار نہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری سیاسی پارٹیاں ابھی تک آنکھ مچولی کا کھیل کھیل رہی ہیں۔ حزبِ اختلاف کا رویہ افسوس ناک ہے۔ وہ مسائل کو سنجیدگی سے سلجھانے کی بجائے نعرے اور پوسٹر بازی میں سرگرم ہے۔ روشنیاں بجھ چکی ہیں اور ہم

بے گور و کفن لاشوں کی طرح جی رہے ہیں۔ ایسے وقت میں صدر بھٹو روشنی کی ایک ایسی کرن ہے جو سوئے ہوئے لوگوں کو جگا کر منزلِ مقصود کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ وقت اب بھی ہمارا منتظر ہے۔ آئیے تمام نفرتوں، کدورتوں کو بھول کر عہد کریں۔ ہم جو ایک نظریہ رکھتے ہیں، ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جمہوریت اور خوشحالی کے خواہاں ہیں۔ ہم سب پاکستانی صرف پاکستانی ہیں۔ ہم نہ مہاجر ہیں، نہ سندھی ہیں، نہ پنجابی ہیں نہ بلوچ ہیں۔ نہ کمرانی ہیں، نہ پٹھان ہیں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی گھر کے مکین ہیں۔ اگر ہم نے صوبوں کی خلیجوں میں اپنے آپ کو بانٹ لیا تو ہمارا ملک بین الاقوامی سطح پر کس طرح اور کیونکر ترقی کر سکے گا۔ ہمارے اندرون ملک کے مسائل تک حل نہ ہو پائیں گے، کیونکہ ہمارے تمام صوبوں کے اقتصادی رشتے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور تمام صوبوں کی خوش حالی اور یک جہتی ہی تمام ملکوں پر خوشگوار اثر مرتب کرتی ہے۔

میں یہ سب کچھ محسوس کرتا ہوں مگر میرا دل نہیں مانتا کہ وہ قوم جس کا ایک نعرہ ہے، ایک عقیدہ ہے، ایک آواز ہے اور جس نے ماضی میں قومی اور ملی اسلامی نظریات کو جلا بخشنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں وہ اب کیونکر غلط انداز میں سوچ سکتی ہے۔

مجھے پورا اعتماد ہے۔ وہ قوم اتنی سفاک نہیں ہو سکتی اور مجھے اس بات پر بھی پورا اعتماد ہے کہ اب تک جو کچھ بھی ہوا، اس کے لیے ہمارے بزرگ رہنما جوابدہ ہیں اور ان تمام سنگین حالات کے قصور وار بھی ہمارے وہی رہنما ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے اکثر ایسے زہریلے تیر پھینکتے رہتے ہیں، مگر اب قوم کو اور زیادہ بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اب قوم جناب بھٹو کی قیادت میں ابھر رہی ہے اور اسے

پوری طرح اور ابھرتا ہے۔ مزدور جاگ اٹھا ہے، کسان جاگ اٹھے ہیں۔ ادیب جاگ اٹھے ہیں اور پاکستان کے تمام محنت کش جاگ اٹھے ہیں۔ پاکستان جاگ اٹھا ہے۔ آئیے عہد کریں کہ وہ پارٹیاں جو حزب اختلاف میں ہیں اور جن کا ہمیشہ سے حکمراں پارٹی کے ساتھ رویہ دشمن جیسا ہے اور جن کی فطرت میں ذرا ذرا سی بات پر فساد کھڑا کر دینا شامل ہے ان کی بے وزن باتوں پر کان نہیں دھریں گے اور صدر بھٹو کی قیادت پر اعتماد کریں گے، ان کے ہاتھ مضبوط کریں گے، تاکہ ہمارے ملک کی بنیادیں مضبوط تر ہوں اور ہمارا ملک ترقی اور شادمانی کی شاہراہ پر گامزن ہو۔



ابوظہبی کے جناب سلطان النہان اور جناب بھٹو

پاکستان ہمارا پیارا ملک ہے، ہمارا گھر ہے۔ ایک ایسا گھر جس کی بنیادوں کو ہم نے، ہمارے باپ دادا نے اپنے گرم گرم سرخ لہو سے ڈالا ہے۔ اس کی دیواروں میں ہم نے اپنی ماؤں بہنوں، بیویوں کی عصمتوں کو گنوا کر اینٹیں لگائی ہیں۔ اس کی مٹی کو ہم نے اپنی ماؤں کے گرم گرم آنسوؤں سے گیلا کیا ہے اور اس

طرح کتنی بڑی بڑی قربانیاں دے کر ہم نے یہ مکان تعمیر کیا ہے۔

پھر کیوں اب ہم اس مکان کی دیواروں کو نفرت اور تعصب کی تلوار سے ڈھائیں؟

میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہوچی منہ کو جگا کر کہوں، "پیارے ہوچی منہ ذرا دیر کے لیے جاگ جائیے اور ہمارے نادان سیاسی رہنماؤں کو بتا جائیے کہ قیادت کس طرح کی جاتی ہے اور قوم کو بیدار کیوں کر کیا جاتا ہے۔ جسموں میں نئی روح، نئی اسپرٹ کس طرح پیدا کی جاتی ہے۔

ہوچی منہ آپ پر لاکھوں سلام، آپ امر ہیں اور آپ کی قوم زندہ و پائندہ





جناب بھٹو

ہے۔"

میں اپنے قائدِ عوام کی طرف دیکھتا ہوں جو جفاکش بھی ہیں اور جن کے نظریات قومی و ملّی سطح پر ہمیشہ سے گہرے اور پائیدار ہیں تو میرا سینہ فخر سے اکڑ جاتا ہے اور یہ سوچتے ہوئے میں مغرور ہو جاتا ہوں کہ پاکستان ویت نام کی طرح جاگ اٹھا ہے چین کی طرح بیدار ہو چکا ہے اور اگر قوم کے تمام افراد نے تعمیری پہلوؤں کی ہمت افزائی کی اور قومی یک جہتی کو اپنا شعار بنایا اور شدید محنت کی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا پیارا ملک امریکہ کی طرح دولت مند، روس کی طرح خوشحال اور اور چین کی طرح مستحکم ہو جائے گا۔

بھٹو، ایک تحریک

"بھٹو کی سیاست رومانس اور شاعری کا حسین امتزاج تھی، بھٹو کو پھانسی کے تختے پر لٹکاتے وقت شاید جنرل ضیاء یہ بھول بیٹھے تھے کہ بھٹو کو پھانسی دے کر وہ پیپلز پارٹی کو اور بھی مضبوط کر رہے ہیں، بھٹو ایک فرد کا نام ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے۔ ایک ایسی تحریک جس کے لیے عظیم قائد نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر اسے زندۂ جاوید کر دیا۔ اور بن با اللہ و سوئیکارنو کے ساتھ افریشیائی اتحاد کا خواب دیکھنے والا لیڈر ایک زندہ تحریک بن کر ملک کی فضا میں ہر سو پھیل گیا۔"

وزیراعظم بھٹو نے جتنی کم مدت میں جس برق رفتاری کے ساتھ ہر شعبے میں اصلاحات کی ہیں، ان کی مثال دنیا کے کسی اور ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ بیمہ کمپنیوں اور بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینا، مفت تعلیم، صحت کی انقلابی پالیسیاں، شملہ سمجھوتہ، دہلی معاہدہ، فوجیوں کی واپسی، اپنے پانچ ہزار مربع میل علاقے کی ہندوستان کے چنگل سے واگزاری، پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی، اسلامی جمہوری آئین، ملک میں فولاد کے کارخانے کا قیام ۔ یہ تمام کارنامے ایسے ہیں جو برصغیر میں کوئی بھی حکومت اتنے کم عرصے میں انجام نہیں دے سکتی ۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو تاریخ کے ایک سنجیدہ طالب رہے، انہوں نے ہمیشہ اپنی سیاسی اور قومی زندگی میں تاریخ سے سبق حاصل کیا، قوموں کی عروج اور زوال کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر ایک تجزیاتی لائحہ عمل طے کیا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ ان کے سامنے تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی حالات جن جن مراحل سے گزرے جناب بھٹو کے سیاسی پروگرام ترتیب دینے میں مددگار ثابت ہوئے ۔ قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے بعد مسلم لیگ کا شیرازہ منتشر ہو گیا ۔ عوام جبر اور استحصال کا شکار ہو گئے ۔ جاگیردار اور سرمایہ دار پوری طرح حکومتی اداروں اور ملکی سیاست و معیشت پر قابض ہو گئے۔ اور ان کڑے حالات

میں مسٹر بھٹو نے قوم کی بنیادی ضروریات روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کیا۔ یہ وہ بنیادی ضروریات ہیں جن کی فراہمی کے لئے ایک اسلامی مملکت ذمہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ بھٹو کے خلاف ایک بار پھر عوام دشمن قوتیں متحرک ہوگئیں، بھٹو کو اسلام دشمن ہونے کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ مگر ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے ایک بڑی تعداد میں اکثریت حاصل کرلی تو پارٹی پر انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا گیا۔ اور ملک میں ہنگامہ آرائی کا آغاز اپوزیشن نے شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ملک میں ہنگامہ آرائی شروع کر دی گئی۔ جناب بھٹو نے پوری دانشمندی سے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی مگر یہ ایک بین الاقوامی سازش تھی جو کامیاب ہو کر رہی چنانچہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو علی الصبح ریڈیو پاکستان نے خبروں کے آخر میں یہ بھی اطلاع دی کہ جی، ایچ، کیو سے جاری ہونے والے ایک پریس ریلیز کے مطابق قومی سلامتی کی خاطر مسلح افواج نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی ہے۔ اسی شام چیف آف دی آرمی اسٹاف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاالحق نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا، " ۱۹۷۳ء کا آئین معطل کر دیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ توڑ دی گئی ہے۔ مارشل لاء انتظامیہ قائم کر دی گئی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو قوی توقع تھی کہ امریکہ کے ساتھ تعلقات معمول پر آنے میں وقت لگے گا۔ اس لئے وہ پی این اے کے ساتھ مذاکرات کو کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ طے کیا گیا ۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو دوبارہ انتخاب کرائے جائیں۔ اس صورتحال سے مطلئن ہو کر وہ سعودی عرب، کویت، لیبیا، ابوظہبی جیسے برادر ملکوں کے ہنگامی دوروں پر چلے گئے تاکہ امریکہ کے ساتھ تعلقات

مزید کشیدہ ہونے کی صورت میں انہیں کم از کم برادر اسلامی ملکوں کی حمایت حاصل ہو اور ان ملکوں کے سربراہوں کی ذاتی کوششوں کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی حکومت اور پی۔این۔اے کے مابین مذاکرات میں پیدا شدہ تعطل دور ہو کر سمجھوتے کی راہ کو ہموار کرسکے۔ ۴ اور ۵ جولائی کو درمیانی شب جب آخری پہر میں فوج کے حکام نے وزیرِ اعظم بھٹو اور اپوزیشن کے رہنماؤں کو زیرِ حفاظت لیا تو وزیرِ اعظم بھٹو کا ردِ عمل خاصہ جارحانہ رہا وہ اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ملک میں خانہ جنگی کا اندیشہ موجود ہے۔ وزیرِ اعظم بھٹو کو پرائم منسٹر ہاؤس مری میں رکھا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو کو کراچی منتقل کر دیا گیا۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاالحق نے سیاسی رہنماؤں خصوصاً وزیرِ اعظم بھٹو کے بارے میں جو شائستہ اور نرم لہجہ اختیار کیا اس سے پیپلز پارٹی کے عام کارکنوں کو یہ تاثر ملا کہ یہ ساری صورتحال آپس میں طے شدہ معاہدے کے مطابق عمل میں آئی ہے اور وزیرِ اعظم بھٹو ہی جنرل ضیاء کے پس پردہ کام کریں گے۔ یہ فوجی کارروائی اتنی غیر متوقع تھی کہ اس قسم کی افواہوں کا ابھرنا فطری بات تھی۔ ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو بیگم نصرت بھٹو نے ۷۰ کلفٹن کراچی میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ صورتحال معمول پہ آتے ہی پیپلز پارٹی ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرے گی۔"

۷ جولائی کو روزنامہ مساوات نے ایک خبر دی کہ چیئرمین بھٹو نے پرائم منسٹر ہاؤس مری کے لان میں چہل قدمی کی۔ انھوں نے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں سگار تھا اور دوسرے ہاتھ میں کتاب ــ اسی دن یعنی ۷ جولائی کو واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر صاحبزادہ یعقوب علی خاں

نے امریکی دفتر خارجہ کے حکام سے ملاقات کی اور پاکستان میں نئی صورتحال سے امریکی حکام کو مطلع کیا۔

۸ جولائی کو چیئرمین بھٹو سے بیگم نصرت بھٹو نے ٹیلی فون پر بات کی، اس موقع پر چیئرمین بھٹو نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ وہ ہر طرح سے خیریت سے ہیں انھوں نے پارٹی کے کارکنان کے نام ایک پیغام بھی دیا کہ "پیپلز پارٹی کے کارکن سیاسی سرگرمیاں شروع ہونے کا انتظار کریں اور آپس میں متحد رہیں۔"

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو فوجی انقلاب کے بعد جنرل محمد ضیاالحق نے ذوالفقار علی بھٹو سے پہلی مرتبہ بالمشافہ ملاقات کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ماحول میں زیادہ تلخی نہیں تھی اور بقول ضیاء الحق ان کی بات کو مسٹر بھٹو نے انتہائی تحمل اور اطمینان کے ساتھ سنا، تاہم اس ملاقات کی جو تصویر اخبارات کو جاری کی گئی تھی اس سے نظر آتا تھا کہ ماحول پوری طرح خوشگوار نہیں تھا اور بھٹو صاحب فوج کے برسر اقتدار آنے سے خوش نہیں تھے۔

۲۸ جولائی ۱۹۷۷ء کو چیئرمین بھٹو اور ملک کے دوسرے سیاسی راہنما رہا کر دیئے گئے تاکہ وہ ۱۸ اکتوبر کو ہونے والے انتخابات میں حصہ لے سکیں۔ ۱۷ سے ۲۸ جولائی کے دوران پارٹی کے کارکنوں نے کئی مرتبہ جناب بھٹو سے ملاقات کی۔ اسی "زیر حفاظت" صورتحال میں جناب بھٹو نے کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی۔ دراصل اس اجلاس میں وہ تمام لوگ شریک تھے جو معزول کابینہ میں بھی شامل رہ چکے تھے۔ بیگم بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو نے چیئرمین بھٹو کی عدم موجودگی میں کارکنوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھا تاکہ ان کے حوصلے بلند تر رہیں۔

چیئرمین بھٹو رہائی کے فوری بعد کراچی چلے آئے تاکہ ۲ اگست کو کراچی میں

پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کر سکیں۔ اسی اجلاس کے ایجنڈے کا سب سے اہم آئٹم انتخابات میں حصہ لینے کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ لیکن ۲۰ جولائی ۱۹۷۷ء کو پیپلز پارٹی کے متعدد عہدے دار نظر بند کر دیئے گئے۔

۳ اگست کو چیئرمین بھٹو کی صدارت میں پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ پیپلز پارٹی اکتوبر کے انتخابات میں بھرپور حصہ لے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ چیئرمین بھٹو رابطہ مہم کا آغاز پنجاب سے کریں گے۔

۷ اگست کو چیئرمین بھٹو نے ملتان میں اور ۸ اگست کو لاہور میں کارکنوں سے خطاب کیا۔ دونوں مقامات پر ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ لاہور میں بعض غیر ذمہ دار لوگوں نے جمعیت العلمائے پاکستان کے قائد مولانا نورانی کے ساتھ بدتمیزی کی۔ جب چیئرمین بھٹو کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے اس واقعہ پر دلی افسوس کا اظہار کیا اور اسے قابل مذمت قرار دیا۔ دراصل قائد عوام سیاست کے میدان میں سیاسی داؤ پیچ استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ لاہور میں جناب بھٹو کا اس قدر شاندار استقبال ہوا کہ پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے اور صاف ظاہر تھا کہ اکتوبر کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی یقینی ہو گی اور پی، این، اے سسک کر دم توڑ دے گی۔

۱۰ اگست کو چیئرمین بھٹو نے پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"پیپلز پارٹی سے باہر جانے والے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پی این اے کی مدد کریں گے۔ میں کہتا ہوں ان لوگوں کی پیپلز پارٹی کے مقابلے میں کیا اہمیت ہے۔ اگر ان میں اتنی اہلیت تھی تو کرنل شریف کے پاس کیوں جاتے تھے اور انہیں کیوں بتاتے تھے کہ مختلف جماعتوں میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ اس وقت بھی موٹی موٹی آنکھ نکال کر کہتے تھے کہ منشور، پیپلز پارٹی کا ہم نے بنایا ہے۔ لیکن ان میں اتنی عقل نہیں کہ پہلے پارٹی بنتی ہے،

پھر منشور بنتا ہے اور پارٹی انھوں نہیں بنائی۔"

چیئرمین بھٹو نے مارشل لاء انتظامیہ پر بھی شک کا اظہار کیا اور فرمایا۔ مولانا مفتی محمود کو رہائی کے بعد جنرل ضیاء کیوں اپنے ہیلی کاپٹر میں راولپنڈی لائے؟"

۱۲ اگست جناب بھٹو نے پشاور میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ پیپلز پارٹی جیتے گی اور دوبارہ برسر اقتدار آکر انقلابی اصلاحات کا سلسلہ جاری رکھے گی۔

الیکشن اکتوبر کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرائے گئے تو پی، این، اے ٹکٹوں کی تقسیم کے سوال پر انتشار کا شکار ہو گئی۔ کوٹہ حاصل کرنے والی کئی جماعتوں کو مضبوط امیدوار نہیں مل سکے۔

۲۰ اگست ۱۹۷۷ء کو پیپلز پارٹی نے پہلی کامیابی اس وقت حاصل کی جب غلام مصطفیٰ جتوئی قومی اسمبلی کے لئے پیپلز پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔

۲۷ اگست کو جناب بھٹو تین روزہ دورے پر راولپنڈی پہنچے لیکن ان کی آمد سے پہلے ہی مقامی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن پھر بھی چیئرمین بھٹو نے کارکنوں کے ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کیا اگلے دن انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات کی جس میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی گرفتاری و پیپلز پارٹی کے خلاف پروپیگنڈہ مہم اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی کردار کشی کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا۔ اس سے ایک دن پہلے یعنی ۲۷ اگست کو انہوں نے یہ بھی اندیشہ ظاہر کیا کہ انہیں بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔

چیئرمین بھٹو نے جنرل ضیاالحق سے ملاقات کے بعد سعودی عرب، لیبیا، اور عرب امارات کے سفیروں سے بھی ملاقات کی اور ۲۹ اگست کو انہوں نے خصوصی طور پر عرب امارات کے سفیر سے دوبارہ بھی ملاقات کی باور کیا جاتا ہے کہ اس ملاقات میں چیئرمین بھٹو نے متحدہ عرب امارات کے سربراہ شیخ زید بن سلطان النہیان کے نام پیغام میں انہیں نئی صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس ملاقات کا مقصد نجی سطح پر تعلقات کو مزید مستحکم کرنا تھا۔

اس مہم کے دوران بھٹو قیادت کی مخالف لابی پوری طرح سرگرم عمل تھی۔ بعض اخبارات کو سرکاری دستاویزات کی کاپیاں فراہم کی گئیں تاکہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی سرعام ہو لائی جائے، لیکن ان دستاویزات میں ایسی کوئی دستاویز موجود نہیں تھی جس سے پتہ چلتا ہو کہ وزیراعظم بھٹو نے انتخابات میں دھاندلی کا حکم دیا ہو یا پارٹی کے امیدواروں کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دی ہو۔ ان دستاویزات اور کہانیوں کی فراہمی میں وہ لوگ شامل تھے جو کبھی ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی ساتھی ہونے کے علاوہ اہم سرکاری عہدوں پر فائز بھی رہے تھے۔ بھٹو فیملی کی کردار کشی کی مہم عروج پر تھی۔ ان کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کے دوسرے رہنما بھی شدید تنقید کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کی مقناطیسی شخصیت ووٹروں کو ایک بار پھر اپنی طرف راغب کر رہی تھی۔

یکم ستمبر کو مس بے نظیر بھٹو نے کھنڈ ہاؤس اسلام آباد میں مردان کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے چیئرمین بھٹو کے خلاف مقدمات اور اخبارات میں درج الزامات کی شدید تردید کی انہوں نے کہا، "میرے والد (چیئرمین بھٹو) کے خلاف تمام الزامات غلط ہیں اور میں چیئرمین بھٹو کے ساتھ انتخابی مہم میں بھرپور

حصّہ لوں گی۔"

۴ ستمبر کی صبح چیئرمین بھٹو کو نواب محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا یہی وہ اداس صبح بھی جب پاکستان کی تاریخ میں ایک خونی کہانی کا آغاز ہوا۔

اپنی رہائش گاہ چھوڑتے وقت چیئرمین بھٹو نے کارکنوں کے نام اپنے پیغام میں اتحاد قائم رکھنے پر زور دیا۔ بعد میں بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی سیکرٹریٹ میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"حوصلہ بلند رکھو، چوکس رہو، فتح عوام کی ہوگی، محنت کشوں کی ہوگی، انشاءاللہ ملک میں جمہوریت کا سورج طلوع ہوگا اور عوام کامران و خوش ہوں گے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت کارکنوں کا اتحاد ہے۔"

۸ ستمبر کو نیویارک ٹائمز میں جنرل ضیاءالحق نے اپنے ایک انٹرویو میں مسٹر بھٹو کی گرفتاری، اس سے پیدا ہونے والی صورتحال اور عام انتخابات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا، مسٹر بھٹو کی گرفتاری سے پیدا شدہ حالات کے باوجود میں اگلے ماہ عام انتخابات کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے بھٹو کی سرگرمیوں سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود بالکل غیر جانبدار پالیسی اپنا رکھی ہے۔ میں نے ان (بھٹو) کی گرفتاری کا حکم اس وقت تک نہیں دیا جب تک ان کے خلاف متعدد دستاویزی شہادتیں مہیا نہیں کی گئیں۔ مجھے احساس ہے کہ مسٹر بھٹو کو اس وقت بھی بہت بڑی سیاسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایسی طاقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۲ ستمبر کو مقدمے کا چالان عدالت میں پیش ہوا اور ۱۳ ستمبر کو لاہور ہائیکورٹ نے ذوالفقار علی بھٹو کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ وہ سیدھے نواب صادق حسین قریشی کی

کوٹھی پر گئے ۔ اس دن ضیاالحق نے سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے بات چیت کی ۔ اگلے دن وہ ایک روزہ دورے پر ایران چلے گئے ۔ جہاں انہوں نے شاہ ایران سے ملاقات کئے ۔ ۱۴ ستمبر کو ہی محمود مسعود وعدہ معاف گواہ بن گئے ۔

۱۷ ستمبر یعنی صرف چار دن بعد چیئرمین بھٹو اور کئی دوسرے رہنما ایم ایل او ۱۲ کے تحت پھر گرفتار کر لئے گئے ۔

چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کے بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاالحق نے ۱۷ ستمبر کو ایک بیان میں کہا ، "سابق وزیر اعظم بھٹو نے انتخابات سے قبل مقدمہ چلانے کی پیش کش کی تھی ، میں نے انکی پیشکش قبول کر لی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ ان پر اور ان کے ساتھیوں پر جنہیں آج نظربند کیا گیا ہے فوجی عدالتوں میں غیر جانبدارانہ مقدمات چلائے جائیں اور ان کا فیصلہ انتخابات سے پہلے کر دیا جائے ۔ اس سلسلہ میں تمام متعلقہ اداروں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ مقدمے کی سماعت اور تحقیقات کا عمل کسی تاخیر کے بغیر شروع کیا جائے تاکہ فیصلہ انتخابات سے پہلے ہو سکے ۔ پیپلز پارٹی کے جن رہنماؤں کے خلاف سول عدالتوں میں جو مقدمات زیر سماعت ہیں ، ان میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا جائے گا ۔"

چنانچہ ۱۸ ستمبر کو ہی نواب محمد احمد خاں کا مقدمہ قتل لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ کے سپرد کر دیا گیا ۔ جو چیف جسٹس مسٹر جسٹس مشتاق حسین ، جسٹس ایم ایس قریشی ، جسٹس ذکی الدین پال ، جسٹس گلباز اور جسٹس آفتاب حسین پر مشتمل تھا ۔ اسی دن ذوالفقار علی بھٹو کو لاڑکانہ سنٹرل جیل سے کراچی بھی منتقل کر دیا گیا ۔

۱۹ ستمبر کو ذوالفقار علی بھٹو کی نظربندی کے خلاف سپریم کورٹ میں درخواست دائر کر دی گئی ۔ حکومت نے نواب محمد احمد خاں کا مقدمہ قتل کا چالان عدالت میں

پیش کر دیا اور بیگم نصرت بھٹو نے لیاقت باغ راولپنڈی میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔" پیپلز پارٹی عوام سے غداری نہیں کرے گی۔ صرف بھٹو ہی نہیں بلکہ میرا پورا خاندان پاکستان کے اتحاد و سالمیت یکجہتی اور عوام کی خوشحالی کے لئے اپنی جانیں قربان کر دے گا۔ میں اس عہد کا اعلان اس مقدس مقام سے کر رہی ہوں جہاں پاکستان کے پہلے وزیراعظم کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

شہید ملت کے لہو کو گواہ رہنا میں نے یہ مقدس عہد کیا تھا۔ مزدور، کسانوں، ساتھیوں، اور پیارے طالب علموں ___ تم بھی گواہ رہنا ___ ۱۹۷۲ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے صدر تھے، اسی جگہ انہوں نے اندرا گاندھی کو ۹۰ ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کے بدلے اپنے بیٹے کی پیش کش کی تھی ___ اگر بھٹو خاندان کو دس بار بھی زندگی مل جائے تو وہ اسے ہر بار وطن اور عوام پر قربان کر دیں گے، بھٹو لوگوں کے دلوں میں ہیں، وہ عوام کے ترجمان ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت یہ استحقاق ان سے چھین نہیں سکتی۔ بھٹو اور عوام ایک چیز ہیں۔ انہیں عوام سے جدا نہیں کیا جا سکتا بھٹو عوام کے ساتھ جیئیں گے اور عوام کے ساتھ ہی مریں گے۔

چیئرمین بھٹو کی عدم موجودگی میں ان کی ہونہار بیٹی اور بیگم نے بڑی کامیابی اور مہارت سے سیاسی محاذ سنبھال رکھا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الیکشن اکتوبر پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے جیت جاتی۔

۲ ستمبر کو بیگم نصرت بھٹو کو پیپلز پارٹی کا قائم مقام چیئرمین، صاحبزادہ فاروق علی خاں کو وائس چیئرمین، مولانا کوثر نیازی کو سیکرٹری جنرل اور ملک معراج خالد کو سیکرٹری اطلاعات چن لیا گیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کو سندھ اور امان اللہ گچکی کو بلوچستان کا صدر نامزد کر دیا گیا۔ پنجاب میں رانا شوکت محمود کو جنرل سیکرٹری

اور نرگس نعیم سندھو کو ڈپٹی جنرل سیکرٹری کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں ——
دو دن بعد یعنی ۲۱ ستمبر کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ہی پاکستان مسلم لیگ کے رہنما چوہدری ظہور الٰہی نے مطالبہ کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی جائے۔ ۲۱ ستمبر کو ناصر باغ لاہور میں بیگم نصرت بھٹو نے عظیم الشان جلسے سے خطاب کیا اور واضح کیا کہ الیکشن پیپلز پارٹی کی جھولی میں جا گرے گا۔

۲۲ ستمبر کو جسٹس شیخ انوار الحق سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مقرر کر دیئے گئے۔

۲۳ ستمبر کو انہی سے صدر مملکت چوہدری فضل الٰہی نے حلف لیا۔ اسی روز جسٹس محمد افضل چیمہ، جسٹس دراب پٹیل، جسٹس قیصر خان اور جسٹس محمد حلیم نے سپریم کورٹ کے جج اور جسٹس وحید الدین احمد اور جسٹس نعیم حسن شاہ نے ایڈہاک جج کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اسی دن ذوالفقار علی بھٹو کو کورٹ لکھپت جیل لاہور منتقل کر دیا گیا۔

۲۶ ستمبر کو قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو نے چونگی امر سدھو میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا "عوام کا سیلاب بڑھتا ہی جائے گا۔ اس سیلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی بھی اس عوام کے سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قومی اتحاد والے کہتے ہیں کہ بھٹو کو سزا دو، ظہور الٰہی کہتا ہے کہ بھٹو کو سزا دو۔ یہ سب یہودیوں کے چیلے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا بھٹو کو سزا اس لیئے دی جائے کہ انہوں نے پاکستان کو بچایا ۔۔؟"

۲۸ ستمبر کو قصور، للیانی اور کاہنہ میں جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے مس بے نظیر بھٹو نے کہا، "میں اس بھٹو کی بیٹی ہوں جس نے آج تک ظالموں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ میں اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہی ہوں۔ خدا میری حفاظت

نہ کریں گے۔

۳۰ ستمبر کو جب مس بے نظیر بھٹو ساہیوال میں تھیں، انہیں ۳ اکتوبر تک نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کی مدت ختم ہونے کے بعد انہوں نے ۴ اکتوبر کو جیل میں بھٹو سے ملاقات کی۔ اگلے دن وہ ایک بار پھر جیل میں بھٹو سے ملاقات کرنے کوٹ لکھپت جیل گئیں۔

۲۹ ستمبر کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق نے ایک دعوت میں بات چیت کرتے ہوئے کہا، انتخابات ملتوی کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ دس اکتوبر تک کر دیا جائے گا۔ تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے مجھ سے فرداً فرداً ملاقات کی ہے، اور انتخاب کے التواء کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اگر وہ واقعی انتخابات کا التوا چاہتے ہیں تو عوام کے سامنے کھل کر اس کا اظہار کریں۔

اگلے دن صرف نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ سردار شیر باز خان مزاری نے کوئٹہ میں اخبار نویسوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے "ملکی مفاد" میں انتخابات کے التوا پر اعتراض نہیں کیا۔ جبکہ نشتر پارک کراچی میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ پیپلز پارٹی انتخابات ملتوی کرنے کی مخالف ہے۔ تحریک استقلال کے اصغر خان نے مریدکے میں مطالبہ کیا کہ انتخابات مقررہ وقت پر ہوں اور خان قیوم نے پشاور میں کہا کہ انتخابات ملتوی کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اسی روز مس بے نظیر بھٹو کو تین اکتوبر تک ساہیوال میں نظر بند کر دیا گیا۔ یکم اکتوبر کو اعلان کیا گیا کہ انتخابات ملتوی کر دیئے گئے۔ انتخابات سے پہلے احتساب ہوگا۔ اس اعلان پر پیر پگارہ، خان عبدالقیوم خاں، میر نبی بخش زہری، اور شیخ شوکت نے خیر مقدم کیا۔ پیر صاحب پگارہ نے کہا کہ ملک کو انتہائی خوفناک بحران سے بچا لیا گیا ہے، خان عبدالقیوم خاں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا کہ اس

سے کشیدگی کی فضا ختم ہو جائے گی، نبی بخش زہری نے کہا کہ سیاسی تلخیاں دور ہوں گی۔ جب کہ شیخ شوکت کا خیال تھا کہ اس سے اقتصادی حالات بہتر ہوں گے۔

جنرل ضیاء نے احتساب کے عمل کے سہارے انتخابات ملتوی کر دیئے اور ذوالفقار علی بھٹو کو محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل میں گرفتاری سے لے کر سزائے موت کے خلاف رحم کی اپیل مسترد ہونے میں پورے ۱۸ مہینے کا عرصہ حائل رہا۔ اس دوران تقریباً ساڑھے پانچ ماہ کی سماعت کے لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ نے انھیں سزائے موت سنا دی۔ انہوں نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ چار دن تک خود عدالت عظمیٰ میں دلائل پیش کیے اور کہا "مجھے سپریم کورٹ پر مکمل اعتماد ہے۔ آپ میری معروضات نہایت تحمل سے سنیں۔ اب آپ بے شک مجھے پھانسی کی سزا دے دیں۔"

سپریم کورٹ کے سات میں سے تین ججوں نے انہیں بے گناہ قرار دیا اور چار نے مجرم۔ اپیل کی سماعت نو ججوں پر مشتمل فل بنچ نے شروع کی تھی جس میں سے ایک جج دوران سماعت ریٹائر ہو گئے اور ایک جج بیمار ہونے کے باعث مقدمے کی سماعت سے الگ ہو گئے۔ اس دوران سپریم کورٹ کا اکثریتی رائے کا فیصلہ بھٹو کے خلاف ہوا۔

سپریم کورٹ کے تین ججوں کے اختلافی نوٹ کے باعث پاکستان پیپلز پارٹی کے چند لوگ مطمئن تھے انہی دنوں ۲۷ مارچ کو جسٹس صفدر شاہ نے ایک بیان میں کہا کہ اگرچہ چار ججوں نے مسٹر بھٹو کو مجرم قرار دیا ہے مگر وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ عدلیہ کی طرف سے ایک ہلکا سا اشارہ ہی سزائے موت کو منسوخ کرنے کے لئے

کافی سمجھا جاتا ہے اور جہاں تک انھیں یاد ہے، ابھی تک کسی انتظامی سربراہ نے عدلیہ کی سفارش کو نظر انداز نہیں کیا۔

سپریم کورٹ سے نظر ثانی کی درخواست مسترد ہونے کے بعد انتظامیہ نے بڑی تیزی دکھائی اور موت کا پروانہ ذوالفقار علی بھٹو کے وکیل کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن اس میں پھانسی دینے کی تاریخ کا انکشاف نہیں کیا گیا تھا تاہم بھٹو کے وکلائ نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ فیصلہ پڑھنے کے بعد ان میں سے ایک وکیل نے کہا۔ "مجھے مایوسی ہوئی ہے۔ لیکن میں مطمئن ہوں اور بھٹو صاحب کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔

عالمی پریس نے بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے فیصلے پر کئی رپورٹیں شائع کیں۔ ایشیا ویک نے اپنے ۴ مئی ۱۹۷۹ء کے شمارے میں تحریر کیا۔

"ایک سیاست داں کا جرنیلوں سے مقابلہ تھا اور اس بارے میں کبھی شک نہیں ہوا کہ کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ بھٹو کی پھانسی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ لیکن قریبی شاہدین جانتے تھے کہ پانسہ پلٹ چکا ہے۔ بینظیر نے جب اپنی والدہ کے ہمراہ اپنے والد سے آخری ملاقات کی تو انہیں بتایا گیا کہ حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن وہ نظر بند ہیں، اس لئے کسی کو بتا نہیں سکیں۔ اس کے بعد بھٹو خاندان کے سربراہ نواب نبی بخش بھٹو سے کہا گیا کہ وہ بتائیں ان کا خاندان ذوالفقار علی بھٹو کو کس جگہ دفن کرنا چاہتا ہے۔ بھٹو کی ہمشیرہ سے کہا گیا کہ وہ بدھ کو صبح لاڑکانہ پہنچ جائیں تاکہ خودمیت کو وصول کر سکیں۔ یہ سب انتظامات ہو رہے تھے مگر حکام لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ پھانسی کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

فار ایسٹرن اکنامک ریویو کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ آخری وقت تک راز میں رہا۔ قانون کے تحت ضروری تھا کہ بھٹو اور ان کے اقارب کو پھانسی کی تاریخ اور وقت کے بارے میں ۴۸ گھنٹے پہلے مطلع کیا جاتا اور آخری وقت وہ جس سے ملاقات کرنا چاہتے انھیں ملوادیا جاتا۔ پھانسی دینے سے پہلے نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ان کے ساتھ ملایا گیا۔ یہ ملاقات معمول کی ایک گھنٹہ کی ملاقات کی بجائے تین گھنٹے جاری رہی جس سے شبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کی آخری ملاقات ہوسکتی ہے۔ اس آخری ملاقات کے بعد انہیں اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کا موقع دیئے بغیر سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی دن تین اور رشتے داروں نے بھٹو سے ملنا تھا، انہیں ملاقات کے بغیر ہی واپس بھیج دیا گیا۔ جب انہوں نے پوچھا کہ انہیں آخری ملاقات کے لئے بلایا گیا تھا تو انہیں کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا۔ عام طور پر رحم کی اپیل مسترد ہونے کی اطلاع جیلر کو دے دی جاتی ہے جو سات دن کے اندر مجرم کو پھانسی دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے مگر تین اپریل کی شام تک حکام اخبار نویسوں کو یہی بتاتے رہے کہ ابھی رحم کی اپیلوں پر غور ہو رہا ہے اور ان اپیل گزاروں میں ذوالفقار علی بھٹو کے رشتے داروں میں صرف ان کی سوتیلی بہن شامل تھیں جنھوں نے رحم کی اپیل دائر نہ کرنے سے متعلق بھٹو کی بات ٹھکراتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے بچے کی چاہتی ہیں اور وہ ان پر حکم نہیں چلاسکتا۔

اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ صدر ضیاء مسٹر بھٹو کی جان بخشی کر دینگے مگر فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ جیل میں بند رہنے کے باوجود بھٹو حکومت کے لئے دردِ سر تھا اور مزاحمت کی علامت بھی۔

صدر ضیاءالحق پر بہت دباؤ تھا مثلاً مقتول کے بیٹے احمد رضا قصوری نے ۳۰ مارچ کو ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ اگر بھٹو جیل میں زندہ رہا یا اسے جلاوطن کر دیا گیا تو وہ ایک دن یقیناً برسراقتدار آجائے گا اور وہ ججوں اور جرنیلوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ احمد رضا قصوری نے فوجی حکام کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ فوجی انقلاب کے ذریعے برسراقتدار آئے ہیں اور یہ آئین کو منسوخ کرنا غداری ہے۔

ایشیا ویک نے ۴ مئی کی اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا کہ صرف سعودی عرب کے شاہ خالد ایسے شخص تھے جو مسٹر بھٹو کو سزائے موت کے منہ سے بچانے کے لئے جنرل ضیاءالحق پر اثرانداز ہو سکتے تھے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کی جان بخشی کے لئے اپیل کی مگر سعودی عرب نے بھی دوسروں کی طرح محض رسمی طور پر رحم کی اپیل کی تھی۔ اس سے جنرل ضیاءالحق اور ان کے ساتھیوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر وہ مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دیں تو عرب اور دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات متاثر نہیں ہوں گے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کی دوسری وجہ وہ رپورٹ تھی جو پاکستان میں مقیم امریکی ماہرین نے تیار کی تھی۔ ان ماہرین جن کا تعلق انٹیلی جنس سے تھا۔ باقاعدہ سروے کیا اور اپنی رپورٹ پیش کی تھی یہ سروے خالصتاً امریکی انداز میں کیا گیا تھا جس کے تحت عام لوگوں کی رائے معلوم کی جاتی ہے۔ اپنی ماہرین نے اس رپورٹ میں بتایا کہ اگر مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی جائے تو عوام کی طرف سے وہ شدید ردعمل نہیں ہوگا جس کی پیش گوئی مسٹر بھٹو نے کی تھی۔

بھٹو کی سزائے موت کے خلاف بیرونی ممالک اور سینکڑوں ملکی وکلاء نے بھی رحم کی اپیلیں کیں۔ لیکن یہ سب اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔ بھٹو کی موت کے

دوسرے دن برطانیہ کے کمرشیل ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر ضیاء الحق نے کہا۔
"یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں۔"

جب ان سے سوال کیا گیا کہ انہیں مسٹر بھٹو کو پھانسی دینے اور جاں بخشی کی اپیلیں مسترد کرنے کے فیصلے پر افسوس ہے کہ صدر ضیاء نے جواب دیا۔ "نہیں! بالکل نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ملک کی دو بڑی عدالتوں کے مسٹر بھٹو کو مجرم قرار دینے کے بعد میرے پاس اس فیصلے میں ترمیم کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ فوجی کونسل نے کیا۔ صدر ضیاء الحق نے اپنے فوجی رفقاء سے کہا کہ انہیں ان کے فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ اس پر کوئی فوجی بھٹو کی حمایت میں نہیں بولا۔ لیکن زیادہ تر لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ فیصلہ خود صدر ضیاء الحق نے کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کی خبر جوں ہی ملک میں پھیلی، چاروں طرف آگ لگ گئی۔ ہنگاموں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ سرکاری اور نجی املاک کو کسی امتیاز کے بغیر غم و غصہ کا نشانہ بنایا گیا۔ کارکنوں اور نوجوانوں کی مشتعل ٹولیوں نے سڑکوں پر نکل کر سڑک پر آنے والی ہر بس اور کار کو آگ لگا دی حتیٰ کہ موٹر سائیکل سوار بھی ان سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ لوگ غصے اور غم سے پاگل ہو رہے تھے۔ فضا جنرل ضیاء کے خلاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ کئی شہروں میں ماتمی جلوس نکالے گئے۔ گڑھی خدا بخش کے نزدیکی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کارکنوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی قبر کا رخ کیا جہاں ہر لمحے ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بھٹو فیملی کے قبرستان کے ارد گرد فضا میں کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ تناؤ موجود تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے لوگوں سے دور رکھے

گئے تھے۔

کارکنوں کی ٹولیاں آتیں ۔ گریباں چاک ننگے پاؤں ، روتے چہرے ۔ ان سب کی زبان پر صرف ایک ہی بات تھی ۔ مولا ! یہ کیا ہوا ۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ، عورتیں بین کر رہی تھیں ۔ اگر پارٹی کے مرکزی لیڈر کارکنوں کو یہ بات بتا دیتے کہ بھٹو کو پھانسی دی جا رہی ہے تو شاید آج تاریخ کے صفحات پر کچھ اور لکھا ہوتا اور کارکن جان کی قربانیاں دے کر بھٹو کی جان بچا لیتے ۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ۔

بھٹو کو پھانسی پر لٹکانے والے جنرل ضیاء الحق شاید یہ بھول گئے تھے ۔ کہ بھٹو کو پھانسی دے کر وہ بھٹو کو اور بھی زیادہ مضبوط کر رہے ہیں ۔ کیونکہ بھٹو ایک فرد ہی کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک ہے ۔ ایک ایسی تحریک جس کے لئے اس کے عظیم قائد نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اسے زندہ جاوید بنا دیا ۔۔۔ اور بن باللہ اور ڈاکٹر سوئیکارنو کے ساتھ افریشیائی اتحاد کا خواب دیکھنے والا ذوالفقار علی بھٹو ایک زندہ تحریک بن کر ملک کی فضا میں ہر سو پھیل گیا ۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر لٹکانا ہماری قومی زندگی جہاں ایک المیہ ہے وہاں تاریخ کے صفحات کا ایک نہایت ہی تاریک باب بھی ۔ ذوالفقار علی بھٹو جیسے افراد قوموں میں کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں اس پر کئی صدیوں تک اگر قوم ماتم کرے تو یہ بھی بہت کم ہے ۔ میرا ایمان ہے کہ موت کے دہانے پر کھڑا ہوا شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا ۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک ذہین ترین فرد تھے ، ایک قابلِ ستائش سیاست داں ان کی تمام خوبیوں کا نچوڑ ان کے اس خط میں ملتا ہے جو انہوں نے پھانسی کی کوٹھری سے فرانس کے صدر جسکارڈ کے نام

تحریر کیا۔

ڈیئر مسٹر پریذیڈنٹ

اگر موت کی اس کال کوٹھڑی سے جس پر سخت ترین حفاظتی پہرہ ہے۔ ہاتھ باہر نکالنا اتنا مشکل نہ ہوتا تو میں آپ کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے بہت پہلے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت جبکہ میں زندگی اور موت کے ترازو میں جھول رہا ہوں، مسٹر صدر آپ جانتے ہیں میرا ضمیر اور دل کی سچائی۔ آپ کے مشفقانہ لگاؤ کے نتیجے میں ممنونیت کے اظہار پر پیش از وقت مجبور کر رہی ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو لیکن میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک معصوم آدمی کی موت بچانے کے لئے آپ نے جس تردد کا مظاہرہ کیا ہے اس سے آپ اور آپ کے ملک کے عوام نے پاکستانیوں کے دل جیت لئے ہیں۔

فرانس ۱۷۸۱ء سے پہلے خاص طور پر اور اس کے بعد عام طور پر مغربی تہذیب کا عظیم مرکز رہا ہے۔ لگ بھگ ۱۹۵۸ء تک فرانس جنت کی نظیر بنا رہا۔ اس سے پہلے مجھے یورپ کے بارے میں اس انداز سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یورپ کے وہ سامراجی عزائم ہیں جس کے سامنے میں ہمیشہ سینہ سپر رہا ہوں۔

آپ نے کمیونسٹ چیلنج کا براہِ راست اپنی ٹیکنالوجی اور ٹیکنک کے ساتھ مقابلہ کیا ہے خارجی طور پر ایک سرد جنگ لڑی

ہے اور اب اپنے دفاع کو تقویت بخش کر طاقت کا توازن قائم کر لیا ہے۔ کمیونسٹ ریاستوں کے ساتھ آپ کے روابط کی حالت حوصلہ کن ہے۔ روس اور چین کے ساتھ آپ کے تعلقات کا توازن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

داخلی طور پر یورپ کمیونزم اور اسی قسم کے دوسرے نظام حکومت کے اثرات کی وجہ سے فوجی بغاوت کی اس "چیونگم" سے چھٹکارا حاصل کرنے کا عظیم مسئلہ درپیش ہے جسے ان فوجی ڈکٹیٹروں نے جنم دیا ہے جو قانون کی بحالی کے نام پر حکومتوں کا تختہ الٹتے۔ لیکن لاقانونیت کو رواج دیتے ہیں۔ یہ لوگ آئینی اتھارٹی کو کمیونزم کی دھمکی کے نام پر بے اختیار کرتے اور خود کمیونزم کی وجوہات پیدا کرتے ہیں۔ ان کی پشت پناہی کی وجہ سے یورپ نے خود اپنے اندر تباہی کے بیج بولے ہیں اور یہی مساوات میں بنیادی اختلاف ہو سکتا ہے کہ آپ میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کیوں کہ فرانس نے دو غیر معمولی پیشہ ور سپاہی پیدا کئے ہیں جن کی قیادت میں آپ کے ملک نے قابل ذکر ترقی

کی ۔ (۱) نپولین بوناپارٹ (۲) چارلس ڈیگال ۔

مذکورہ بالا تیسری دنیا کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ لیکن میں فی الحال صرف اپنے ملک کی بات کروں گا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب بڑی قدیم اور پُر وقار ہے لیکن اس وقت یہ وادی ایک بیمار پانی سے سیراب ہو رہی کہ یہاں کے باشندوں کو خوف اور دہشت کی بہت لمبی راتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آزادی سے لے کر اب تک یہ ملک تین بار فوجیوں کے حکومت کے تجربے سے گزرا ہے۔ ہر کامیاب فوجی بغاوت اس ملک کو پہلی فوجی بغاوت کے دور سے بھی کمزور تر کرتی رہی ہے۔ اگر یہی حادثے بھارت کو پیش آتے تو وہ اب تک تین چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔

جی ہاں! لاقانونیت تو ہندوستان میں بھی ہے، لیکن وہاں جمہوریت کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ بڑے سے بڑا سیاست داں بھی ہمارے ڈکیٹڑوں سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔

میں عظیم فتوحات کا امین ہوں اور میری رگوں میں جنگجو بہادروں کا خون دوڑ رہا ہے، میں نے دو بار فوجی آمریت کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے اور آخر کار تیسرے میں موت کے گھاٹ اتارے جانے کا حکم پا چکا ہوں۔ لیکن اگر مجھے

قتل کیا جاتا ہے تو میرا خون برصغیر کے نوجوانوں، مردوں اور عورتوں کے چہروں پر ایسی سرخی بن کر ابھرے گا جیسے بہار کے موسم میں فرانسیسی گلاب کی پتیوں میں ہوتی ہے۔ میں پندرہ سال سے آزادی کے لئے غیر متزلزل جنگ لڑ رہا ہوں۔ میں نے نہرو اور قائداعظم کے شانہ بشانہ کام کیا ہے۔ میں نے ڈیگال کو ان کے عروج کے زمانے میں دیکھا ہے۔ مجھے ماوزے تنگ کی عزت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ میری سیاست رومانس اور شاعری کا امتزاج ہے۔ میں نے آج تک سوائے عوام کے کسی سے محبت نہیں کی۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ "عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں"۔ یہ کوئی سیاسی سلوگن نہیں بلکہ میرا غیر فانی اعتقاد ہے۔

چاہے مغرب کی خود غرض طاقتیں اور مشرق کے اندھے خواہش مند انسان کو تیسری جنگ عظیم کے دھانے پر لے جائیں۔ انسان اس چتا کے جشن کی راکھ سے اور بھی زیادہ طاقتور ہو کر ابھرے گا۔ سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ مرے ہوئے شخص کے لئے مرنے میں فتح سمجھی جائے گی۔ اور مرنے والے کی قبر سے فتح و نصرت کے پھول اگیں گے۔ لہٰذا مسٹر پریذیڈنٹ اگر میں زندہ رہا تو میں ہر حال میں اپنی

جدوجہد جاری رکھوں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے کتنی بھی

بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے۔ عوام کی بھلائی کے

لئے میرے مقاصد کے حصول کی خاطر میرے خاندان کو

ناقابلِ برداشت حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن

میری جدوجہد کا یہ واحد تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ مجھے

امید ہے کہ میرا مرتضیٰ بھٹو نے آپ پر جو بوجھ ڈالا ہے،

آپ نے محسوس نہیں کیا ہوگا کہ ایک بیٹا آخر اپنے باپ

کے لئے اتنا کچھ کرنے کا حق تو رکھتا ہی ہے۔

جہاں تک اس علاقے میں ہونے والی حالیہ تبدیلیوں

کا تعلق ہے تو میرے خیال میں ان پر بحث کرنے

سے پہلے ان خطرات کا ذکر ضروری ہے کہ جن کا

پاکستان کو اندرونی طور پر سامنا ہے۔ پاکستان کو

اندرونی خطرات سے بچانا پہلی ضرورت ہے بہ نسبت

خود کسی نئے یا پرانے بیرونی خطرے سے آگاہ کرنے کے

آپ کے ملک سے میری محبت کو بھی آپ جانتے ہیں اور

آپ سے متعلق میں جو تعریفی جذبات رکھتا ہوں انھیں

بھی آپ جانتے ہیں۔ اگر میں زندہ رہا تو ہم بلاشبہ

انسانیت کی بھلائی کے اقدامات سے حاصل ہونے والی خوشیاں

مشترکہ طور پر محسوس کریں گے۔ لیکن اگر میں ملا جاتا ہوں تو آپ کو دوبارہ ملنے تک کے لئے اس دعا کے ساتھ خدا حافظ کہتا ہوں کہ میرے ملک کے لوگوں کو مفلسی، بے بسی اور بھیک مانگنے سے بچانے کے لئے جو پیشرفت ہم نے کی تھی اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بہتر لوگ آئیں۔

" قاتل قرار دیئے شخص کی حیثیت سے میں اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ میں آپ کو دوست کہوں لیکن مہربانی فرما کر میرے عزت و احترام سے پر جذبات اپنی وفادار اور قابل بیوی کو پہنچا دیجئے اور اپنے بیٹے ہنری کو میرا شفقت بھرا سلام کہیئے۔

سمندر جیسی وسیع عزت اور گہرے

لگاؤ کے ساتھ

ذوالفقار علی بھٹو

بے نظیر، بے نظیر

"محترمہ بے نظیر بھٹو کا وزیراعظم کا منصب سنبھالنا ہی منزل نہیں۔ یہ سفر کا آغاز ہے، انھیں عوام جو "طاقت کا سرچشمہ ہیں" ان کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ ملک کے بیکراں مسائل حل کرنے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جہاں مکمل امن و امان ہو۔ کوئی ماں اپنے بچے کے مستقبل کے لیے پریشان نہ ہو، جہاں کوئی نوجوان احساس محرومی کا شکار نہ ہو، جہاں کلاشنکوف کے بجائے علم و ادب کا بول بالا ہو اور جہاں ملک کا ہر فرد ملک کی ترقی میں پورے ولولوں کے ساتھ حصہ لے سکے اور پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک مضبوط اور مستحکم ملک بن کر نمایاں ہو سکے"

پیپلز پارٹی کے آخری وقت کے دورِ حکومت میں کئی مفاد پرست کسی نہ کسی طرح حکومت کے اہم عہدوں پر قابض ہو گئے ۔ یہ منافق اور بے وفا لوگ تھے اور ساتھ ہی ساتھ بزدل بھی جو صرف اپنے اقتدار اور مفاد کی خاطر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ شامل ہوئے اور بھٹو صاحب کے ساتھ اس وقت تک ساتھ رہے جب تک بھٹو صاحب تختہ دار تک نہ پہنچ گئے۔ بھٹو صاحب کے بعد پیپلز پارٹی کئی محاذوں پر الجھ کر رہ گئی۔ مارشل لاء، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ اور پارٹی کے اندر مفاد پرست، جو سنٹرل کمیٹی، وزارت اعلیٰ، مختلف وزارتوں اور اہم عہدوں پر رہتے ہوئے پارٹی کے کارکنوں کی ہر جدوجہد کو ہر طرح ناکام بنانے کی کوشش میں مصروف عمل تھے۔ پارٹی اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر ان کی سازشوں سے مفلوج سی ہو کر رہ گئی۔

مارشل لاء کے دور میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ جلیں۔ کوڑے، شاہی قلعے میں تشدد، احتساب، قیدیں، مقدمات، ضیاء حکومت نے کس کس طرح دباؤ نہ ڈالا، لیکن بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر نہ جھکنے والی تھیں نہ جھکیں ۔ بے نظیر ایک عظیم باپ کی عظیم بیٹی، بھٹو صاحب نے

دو سیاسی پیش گوئیاں کی تھیں ایک یہ کہ ان کی بیٹی بے نظیر مستقبل میں انھیں مایوس نہیں کریں گی۔ اور دوسرے جب انھوں نے فرانس کے صدر جکارڈ کے نام جیل سے اپنے خط میں تحریر کیا۔

"اگر مجھے قتل کیا جاتا ہے تو میرا خون برصغیر کے نوجوانوں، مردوں، عورتوں کے چہروں پر ایسی سرخی بن کر ابھرے گا جیسے بہار کے موسم میں فرانسی گلاب کی پتیاں ہوتی ہیں۔"

چنانچہ جب ایک طویل دورِ جبر کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے لاہور کی تاریخی سرزمین پر قدم رکھا تو عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم ان کی ایک جھلک دیکھنے کا منتظر تھا۔ لوگوں کے جذبات اور ولولوں سے لبریز قافلے ساری رات بڑی بےچینی سے اپنی قائد کے منتظر رہے۔ یہ ایک تاریخی اجتماع تھا۔ ایشیاء میں اس سے بڑا سیاسی اجتماع اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ لوگوں نے بے نظیر کی تقریر سننے کے لئے چالیس چالیس میل کا سفر پیدل طے کیا۔ مائیں اپنے معصوم بچوں کو گود میں لے کر گھنٹوں بے نظیر کے انتظار میں رہیں۔

بے نظیر نے لاہور، راولپنڈی، کراچی، گوجرانوالہ، پشاور، حیدرآباد کے شہروں میں بڑے بڑے جلسے کئے۔ یہ جلسے انتہائی کامیاب رہے۔ فوجی حکمرانوں نے اپنے ترکش کے تمام تیر ایک ایک کر کے آزما لیے۔ اب ان کے پاس ماسوائے واپسی کے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اور بے نظیر کے پاکستان میں تاریخی عوامی اجتماعات نے ثابت کر دیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی پُرامن تبدیلی چاہتی ہے۔ غرض محترمہ بیگم نصرت بھٹو کی قائدانہ قیادت میں

بے نظیر نے اپنی زندگی کے گیارہ اہم سال ۔ جوان کی عمر کا تہائی ہیں جدوجہد عزم و برداشت اور حوصلے کی ایک لازوال مثالی جدوجہد میں گزار دیئے۔ جناب بھٹو کو اپنی چہیتی بیٹی کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا اور اسی اعتماد کی بنا پر انہوں نے اپنی بیٹی سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری ہوئیں اور ان کے قتل کے بعد واقعی پاکستان پیپلز پارٹی میں نیا خون شامل ہو گیا۔ بھٹو کا اپنا خون ــــ انقلاب کا امین ــــ



محترمہ بے نظیر ۱۹۷۹ء میں پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئر پرسن اور مئی ۱۹۸۶ء میں شریک چیئر پرسن منتخب ہوئیں ــــ انہوں نے اپنی جلاوطنی کے ایام میں امریکہ اور یورپی ممالک کے دورے کئے اور پاکستان میں انسانی

حقوق کی پامالی کے خلاف بین الاقوامی سطح پر مہم چلائی۔ اس کے اعتراف میں ۱۹۸۸ء میں انھیں آسٹریا سے انسانی حقوق کا برنوکریسلی ایوارڈ دیا گیا۔

اپریل ۱۹۸۶ کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے جہاں ملک میں سیاسی جدوجہد کو تیز کیا وہاں پارٹی کو مستحکم و مربوط بنانے پر پوری توجہ دی۔ انہوں نے یہ معاصر حقائق کا ادراک کرتے ہوئے ایسی حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کا ثبوت دیا کہ ان کا ہر ہر قدم کامیابی کی طرف جا نکلا۔

جنرل ضیاالحق نے جو پالیسی بنائی تھی اس کو محسوس کرتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب شاید بھٹو خاندان کبھی برسرِ اقتدار نہ آسکے گا۔ مگر ضیاالحق کی حادثاتی موت کے صرف بارہ ہفتے بعد اقتدار پر فائز ہو جانا ایک معجزے سے کم نہیں ــــ یہ بات اس بات کو پوری طرح واضح کرتی ہے کہ، معاشرے اور ملک میں شدید گھٹن تھی اور یہ کہ جبر و طاقت کے زور پر کسی تحریک کو دفن نہیں کیا جا سکتا۔

عوام کی طاقت نے پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسے نئے باب کا اضافہ کیا جس کی توقع بہت کم لوگ کرتے تھے۔ بے نظیر نے نہ صرف اپنے والد مرحوم کی وصیت کو پورا کیا بلکہ اپنی ماں کی بات بھی سچ ثابت کر دی جو انہوں نے کراچی سے فرانس بغرض علاج

جلتے ہوئے کہی تھی۔

"اس (جنرل ضیاء) کے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کے ظلم کا، اس کے جبر کا دور سکتا ہی طویل ہو جائے، مگر تم دیکھو گے اس کا وقت ختم ہو جائے گا میرے پاس بھی وقت ہے اور میرے خاندان کے پاس بھی، اور ہمارے اندر صبر و استقلال اور جدوجہد کا حوصلہ بھی ہے۔ میں آپ سب کو بتا دیتی ہوں کہ وہ (جنرل ضیاء) میرے خاندان کے صبر و استقلال اور جدوجہد کا مقابلہ نہیں کر سکے گا، وہ چیف آف آرمی اسٹاف کے منصب پر کب تک قابض رہ سکتا ہے۔ اس کی عمر کسی نہ کسی دن تو ختم ہو جائے گی، مگر میری جدوجہد ختم نہیں ہو گی۔ اگر میں نہیں رہوں گی تو میری بیٹی اس سے لڑتی رہے گی۔ میرے بیٹے اس سے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ خدانخواستہ اگر ہم نہ رہے تو پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی میری اولاد اس سے لڑے گی، اس کی آمریت سے لڑے گی اور اس وقت تک لڑائی چلتی رہے گی جب تک ملک سے آمریت ختم نہ ہو جائے اور عوام آمریت پہ غالب آکر ملک کو جمہوریت میں تبدیل نہ کر دیں۔"

الیکشن ۱۹۸۸ء اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام نے آمریت کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور طاقت کا وہ سرچشمہ ایک نئے حوصلے سے طوفان بن کر تمام محرومیوں کو بہا کر لے گیا ــــــ



محترمہ بینظیر بھٹو اور محترم غلام اسحاق خاں تقریب حلف برداری

محترمہ بے نظیر بھٹو کا گزشتہ گیارہ سالہ جبر و استبداد اور ستم کے باوجود ملک کا وزیر اعظم بن جانا اپنے اندر غور و فکر اور عبرت کے بڑے سامان رکھتا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا وزیر اعظم کے منصب سنبھالنے کے بعد جہاں ملک میں ایک نئے تاریخ ساز جمہوری دور کا آغاز ہوا ہے وہاں انھیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایشیا کی پہلی مسلمان وزیر اعظم خاتون ہیں۔

بے نظیر بھٹو ایک تجربہ کار سیاست داں ہیں وہاں وہ عوام کے مزاج سے بخوبی آشنا ہیں۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ہیں، وہ عوام کے دکھ درد کو بھی بخوبی محسوس کرتی ہیں وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ انھیں عوام اور صرف عوام کے لیئے ہی کام کرنا ہے۔ وہ عوام جو طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ ابھی

منزل دور ہے۔ اقتدار کو پالینا ہی منزل نہیں ـــــ منزل عوام کے مسائل ہیں جو بیکراں ہیں اور جنھیں محترمہ بے نظیر کو آہستہ آہستہ ختم کرنا ہے۔ اگر انہوں نے مسائل پر قابو



سارک کانفرنس ۱۹۸۸ء کے موقع پر جناب راجیو گاندھی، جناب میمون عبدالقیوم جناب جنرل ارشاد، محترمہ بینظیر بھٹو، جناب شاہ فرانگ چک، صدر جے وردھنے اور شاہ بریندرا۔

پالیا اور عوام کے دل جیت لئے تو وہ دن دور نہیں جب ملک سے غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ علم کی روشنی سے ملک کا کوچہ کوچہ منور ہو جائے گا اور کوئی بھی رات کو بھوکا نہیں سو سکے گا ـــــ کوئی نوجوان اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہیں کرے گا اور ملک میں امن و امان کا دور دورہ ہو گا۔

انشاءاللہ



توصیف چغتائی

کے نئے افسانوں کا مجموعہ

قیمت :- ۴۰ روپے

ناشر :- تماشا کمیونیکیشن

ایچ /۳/ ایم روائل اسکوائر

نارتھ ناظم آباد کراچی

اردو ادب کی معروف افسانہ نگار

محسنہ جیلانی

کے افسانوں کا مجموعہ

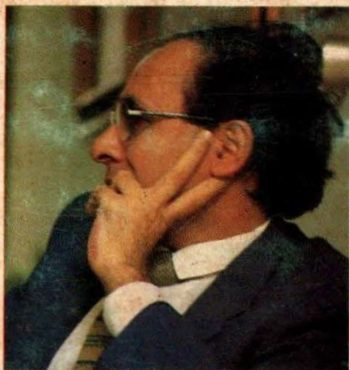
عذاب بے زبانی کا

قیمت :- ۵۰ روپے

ناشر :- تماشا کمیونیکیشن

ایچ/۳- ایم وائی اسکوائر

نارتھ ناظم آباد کراچی



توصیف چغتائی نئی نسل کے اُن چند ذہین اور حقیقت پسند ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کی ہر تحریر خلوص اور انسانی فلاح کے جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے، افسانے زندگی کے روشن پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ موضوعات پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے اور انکی تحریریں زندگی سے قریب تر ہیں۔ انھیں اپنے کئی ڈراموں اور افسانوں پر انعامات بھی مل چکے ہیں، جن میں "سچ اکبر" "ہم سفر" "ہم تن کے اُجلے لوگ" "شہر کے آنسو" "سوکھے پتے" قابلِ ذکر ہیں۔

توصیف فنکار کا حساس دل رکھتے ہیں، جنگ سے نفرت کرتے ہیں اور انسان کی خوشحالی اور سچے امن کے خواہاں ہیں اور ایسی "کل" کے خواب دیکھتے ہیں جہاں طبقاتی کشمکش نہ ہو، ایک صاف ستھرا ماحول ہو جہاں ملک کے تمام لوگ مِل جُل کر ایک اجتماعی احساس کے ساتھ خوشحالی کے لیے جدوجہد کریں اور ملک کا بچہ بچہ آسودہ حال ہو، جہاں انسان کی عظمت کا پیمانہ دولت نہ ہو، بلکہ انسان کو انسان ہونے کے ناطے احترام حاصل ہو۔

جناب ذوالفقار علی بُھٹو توصیف چغتائی کی آئیڈیل شخصیت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بُھٹو صاحب کی شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کیے۔ "ذوالفقار علی بُھٹو، سیاست میں دلبری کے انداز" عنوان صوری و معنوی ہر لحاظ سے ندرت کا حامل ہے۔ یہ تاریخِ پاکستان کے اہم موڑ پر ایک اہم شخصیت کا ایک خاص انداز سے مطالعہ ہے جو یقیناً اس شخصیت کو جاننے کے نئے باب وا کرے گا۔

قوی امید ہے کہ توصیف چغتائی کی یہ کتاب بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح مقبولِ عام ہوگی۔

محمود شام